یہ تنگ زمین!
ترنّم ریاض
Meer Zaheer Abass Rustmani

فَاَجَآءَهَا الۡمَخَاضُ اِلٰى جِذۡعِ النَّخۡلَةِ‌ۚ قَالَتۡ يٰلَيۡتَنِىۡ مِتُّ قَبۡلَ هٰذَا وَكُنۡتُ نَسۡيًا مَّنۡسِيًّا ۝

ترجمہ:

پھر لے آیا اس کو دردِ زہ ایک کھجور کی جڑ میں بولی کسی طرح میں مرچکتی اس سے پہلے اور ہو جاتی بھولی بسری

ترنّم ریاض

مَیس ہیُو نہٕ پرٛکاش کانہہٕ   پِیَس ہیُو نہٕ تیرتھ کانہہ
دَیس ہیُو نہٕ باندھو کانہہ   بَیَس ہیُو نہٕ سوکھ کانہہ

للہ دید

ترجمہ

عرفان جیسا کوئی نور نہیں   آگہی جیسا کوئی تیرتھ نہیں
رب جیسا کوئی دوست نہیں   خوف (خوف الٰہی) جیسا کوئی سُکھ نہیں

YEH TANG ZAMEEN *(Short Stories)*
By : TARANUM RAYAZ   *Rs.150.00*

یہ تنگ زمین

(افسانے)

ترنم ریاض

موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ گولا مارکیٹ ۔ دریا گنج ۔ نئی دھلی ۱۱۰۰۰۲

سی۔ ۱۱ جنگپورہ ایکسٹینشن۔

نئی دہلی ۱۱۰۰۱۴

تعلیم ایم۔ اے، ایم ایڈ وطن وادیِ کشمیر

اشاعت: ۱۹۹۸ء

قیمت: ایک سو پچاس روپے

کتابت: محمد سالم

طباعت: ایچ۔ ایس۔ آفسیٹ پریس، دہلی

سرورق: ارشد علی خاں

زیر اہتمام

پریم گوپال متّل

موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

والدہ محترمہ کے نام

چٹّی چادر لاسٹ کڑیئے پہن فقیراں دی لوئی
چٹّی چادر نوں داغ لگے، لوئی نوں داغ نہ کوئی

ـــــــــــــــــــ بلھے شاہ ـــــــ

فہرست
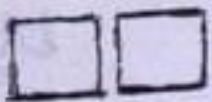
ابتدا

بچپن میں کہانیاں سنی تھیں۔ پڑھی بھی تھیں۔ مگر کہانی سے میرا باقاعدہ تعارف تب ہوا تھا جب میری آپا میٹرک میں پڑھتی تھیں۔ اُن کی اردو کی نصابی کتاب میں، میں نے منشی پریم چند کی دو کہانیاں پڑھی تھیں۔

انہی دنوں میں نے اپنی پہلی کہانی "مصور" لکھی تھی۔ اُس وقت میں ریڈیو کشمیر سری نگر میں بچوں کے پروگرام کی باقاعدہ آرٹسٹ تھی۔ لیکن یہ کہانی مجھ سے نوجوانوں کے پروگرام میں پڑھوائی گئی تھی۔ جس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ کہانی کے ذریعے بہت سی باتیں کی جاسکتی ہیں، سمجھائی جاسکتی ہیں۔

میرے والد اردو، عربی، فارسی اور انگریزی کے جیّد عالم تھے۔ انھوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور میری افسانہ نگاری کا سلسلہ چل نکلا، مگر کبھی بے قاعدگی کے ساتھ کبھی باقاعدگی کے ساتھ۔ میرے خیال سے کہانی فنونِ لطیفہ کی ایک ایسی مضبوط صنف ہے جو اپنی توانائی اور پہنچ سے ذہن ودل پر حاوی ہونے کی قوّت رکھتی ہے۔

جغرافیائی، ماحولیاتی اور ثقافتی حد بندیوں سے لاتعلق، میں کہانیاں بنتی رہتی ہوں اور انھیں حروف کی شکل میں منتقل کرتی رہتی ہوں۔ افسانے میرے لیے اپنے ردِ عمل کے اظہار کا وسیلہ ہیں۔ لیکن یہ وسیلہ بے ہنگم نہیں ہے۔ میں افسانے میں کہانی پن پر مکمل یقین رکھتی ہوں کہ وہ افسانویت کے بنیادی اور اہم تقاضوں کو پورا کرے۔

دنیائے ادب آج، مخصوص نظریوں کی پابندی سے آزاد ہے۔ میں بھی یہ پابندیاں اپنے اوپر نہیں لادتی۔ مگر کچھ بنیادی قدروں سے لاتعلق بھی نہیں ہوں۔ یہ قدریں جو میرے لاشعور کا ایک حصہ ہیں، ان کا کوئی نہ کوئی عکس میرے افسانوں میں ضرور موجود ہے۔

رہی بات موضوع کی، تو موضوع کہاں نہیں ہے۔ ہر شے کے بدلاؤ کے ساتھ موضوع بھی بدلتا ہے۔ بلکہ نئی نئی صورتوں میں، نئے نئے مسائل کے ساتھ سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ کچھ موضوعات پُرانے ہوجاتے ہیں۔ ان کی جگہ نئے لے لیتے ہیں۔ اور کچھ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ کبھی موضوع بدلتا ہے۔ کبھی افسانہ نگار۔ کہانی چلتی رہتی ہے۔ اور ضرورت یہ ہی ہے کہ

کہانی چلتی رہے۔ بغیر کسی سیاست یا ازم کا اثر لیے۔ ایک ایماندارانہ اور اصلاحی اپروچ کے تحت۔ ہمارا گردو پیش کافی حد تک سیاست زدہ ہے بلکہ سیاست سے آلودہ بھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کہانی کو سیاسی بصیرت سے مستفید ہونے کا موقع نہ دیا جائے مگر خود مجھے اپنے دور کی سیاست اکثر ہی متاثر نہیں کر سکی۔ کیونکہ سیاست رسماً انسانی تکالیف کو دور کرنے کا دعویٰ تو کر سکتی ہے مگر یہ دعویٰ صرف نام نہاد کوشش تک ہی محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایک راستباز ادیب اور سیاست داں میں یہی فرق ہے کہ اگر سیاست داں ہیلی کوپٹر میں پرواز کرتے ہوئے آتش زنی اور سیلاب کے مناظر دیکھ کر گھڑی دیکھتا ہے تو ادیب اس منظر پر تڑپ اٹھتا ہے۔ اس کی وجہ پر پہروں سوچتا ہے۔ ایسا نہ ہونے کی دعائیں مانگتا ہے۔ سیاست داں ناک پر معطر رومال رکھ کر آخری رسومات کی منتظر لاشیں دیکھنے، حادثے کے کئی روز بعد پہنچتا ہے تو ادیب ہر لاش کی جگہ خود کو محسوس کر کے سانحے کا کرب اپنے اندر اتار کر اسے قلم بند کرتا ہے۔ اور اس میں بھی میرے خیال سے ہر قلم کار کے سوچنے اور عمل پیرا ہونے کا اپنا طریقہ ہوتا ہے اپنا ایک لیول ہوتا ہے۔ اس حیثیت سے عورت جو درد سہتی ہے، کرب جھیلتی ہے، صبر اوڑھتی ہے، جبر بھوگتی ہے، اس پر زیادہ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں کہ پہلا جنم عورت نے دیا تھا اور پہلا قتل مرد نے کر دکھایا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اسی عورت سے جنمے اپنے ہی بھائی کا۔

ازل سے یہ ہی ہوتا آیا ہے۔ طاقت ہتھیار بناتی ہے تو ممتا روتی ہے۔ مغرور قوتیں تباہیاں پلان کرتی ہیں تو تخلیق خون بہاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اپنی اولاد کو ہم جان لینے کے نئے نئے طریقے ہی سکھلا کر کیوں جا رہے ہیں۔ موت تو آنی ہی ہے۔ اسے بلایا یا لادا کیوں جائے۔

انسان فلک کے اسرار کھوج رہا ہے۔ اپنی مٹی نہیں سنوار سکتا۔

اپنے جدید تر وسائل کے ساتھ ساری دنیا انسان کی پہنچ میں ہے۔ تو پھر اپنی سوچ کہاں نہیں پہنچائی جا سکتی کہ آدمی ہی وہ اشرف مخلوق ہے جو درندگی کی حدوں کے پار جا کر بھی انسانیت کی طرف لوٹ سکتا ہے۔ اسے لوٹ آنے کی ترغیب تو ملے۔

اے عندلیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں
طوفان آمد آمدِ فصلِ بہار ہے
— غالب

ترنم ریاض

یہ تنگ زمین

میں نے جب اپنے خریدے ہوئے خوبصورت کھلونوں کو ڈھیر کی شکل میں لاپرواہی سے ایک کونے میں پھنکا ہوا دیکھا تو مجھے دکھ سا ہوا۔ یہ کھلونے کتنے چاؤ سے لائی تھی میں اس کے لیے۔ یہ چھوٹا سا پیانو ــــ یہ جلترنگ ــــ یہ چھوٹی سی گٹار، چہکنے والی ربر کی بلبل، ٹیں ٹیں بولنے والا طوطا، اور ڈرم بجاتا ہوا ٹیڈی بیئر ــ اور سب سے بڑھ کر یہ پیانو جس میں ستو قسم کی دھنیں، جن سے کئی اور دھنیں بن سکتی تھیں اور جس میں موسیقی کے ہر آلے کی آواز تھی۔ مگر اس نے انھیں چھوا تک نہ تھا۔ وہ تو ایسے کھلونوں کا عاشق تھا۔ کیا وہ خود کو اب میرا نہیں سمجھتا یا اب اسے مجھ سے محبت نہیں رہی۔ وہ جسے میں نے دل کے ایک ٹکڑے کی طرح برسوں سینے میں چھپائے رکھا۔ وہ جس نے میری مجروح ممتا پر تب اپنی معصومیت کا پھاہا رکھا تھا جب میرے دامن میں کھلنے والا پہلا پھول چند سیکنڈ کے بعد ہی مرجھا گیا تھا۔ جب میرے ہونٹوں پر لوریاں صدا پانے سے پہلے بے سُر ہو گئی تھیں اور روٹھی ہوئی نیند کو میں نصف شب تک رو رو کر، کروٹیں بدل بدل کر منانے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ تب ایک سرد رات کے گیارہ بجے میرے شوہر اسے گود میں لیے ہوئے لوٹے۔ اس نے ٹویڈ کا دھاریوں والا ننھا سا پھرن پہن رکھا تھا اور مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنی غیر معمولی لمبائی والی منی منی پلکیں پھڑ پھڑا کر کسی روبو کی طرح جلدی سے کہا تھا "آنٹی مت لوئیے ــ میں آگیا۔ اب مت لوئیے" کہ اس کے انکل اسے راستہ بھر یہ ہی سکھا کر لائے تھے۔ میں مسہری سے اٹھ کر

آنسو پونچھتی ہوئی ان کے قریب گئی اور اسے گود میں لے کر سینے میں چھپا لیا۔ اس کے سردی سے ٹھنڈے چہرے کو میں نے جلتے ہوئے کلیجے سے لگا لیا۔ میرے دل سے خون رسنا تھم گیا۔ اس کے گھنگھریالے بالوں کو آنسوؤں سے دھوتے ہوئے میں بولی۔

" نہیں روؤں میں ؟ کیا تم میرے پاس رہو گے۔ اپنی ماما کے پاس نہیں جاؤ گے؟ آنٹی کے ہی پاس رہ جاؤ گے بولو ؟ "

" ہاں آنٹی پاش رہ جاؤں گا۔ لوج لوج مجھ کو بکی اور چال کیٹ ملیں گے نا ؟ "

اس نے اپنا ادھ چبا چاکلیٹ منہ میں ڈالنے کی کوشش میں اپنے گال پر مل لیا اور خرگوش کی طرح جلدی جلدی سر ہلا کر پوچھا۔ اور پھرن کی اُس جیب میں ہاتھ ڈال دیا جس میں اور چاکلیٹ اور بسکٹ تھے۔

میری تڑپتی ہوئی ممتا کو صبر آ گیا۔

وہ میری بہن کا بیٹا تھا۔ اور میرے شوہر بظاہر میری تڑپ کو بہلانے اور اصل میں خود اپنے دل کے قرار کی خاطر اس دن اسے اس کے گھر سے لے آئے تھے۔ اس کی قربت پا کر میں بھول گئی کہ میری ممتا کے ساتھ اتنا بڑا ناخوشگوار حادثہ پیش آیا تھا۔ بھولی نہیں بھی تھی مگر بہل تو گئی تھی۔ وہ مہینوں میرے پاس رہتا اور کبھی اس کی امی اسے لینے آتی تو باقاعدہ وعدہ کر کے جاتا کہ کب لوٹے گا۔ پھر میرے پاس آنے کے لیے ان کی ناک میں دم کر دیتا اور طے شدہ وقت سے پہلے ہی چلا آتا۔ اس کی ماں بھی اسے کچھ زیادہ نہ روکتی کہ میرا درد وہ جانتی تھی۔ وہ واپس آ جاتا تو بہار آ جاتی گھر میں۔ اس کی عادتیں بھی دل موہ لینے والی تھیں۔ فطرت کا اس قدر عاشق کہ ہر وقت باہر لان میں کھیلتا۔ کمروں میں تو جیسے اسے اپنا آپ قید محسوس ہوتا۔ میری انگلی پکڑ کر کھینچتا ہوا، ننھے ننھے جوتے پہنے چھوٹے چھوٹے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر لے جاتا۔ کبھی پھولوں پر غور کرتا ہوا یا کسی تتلی کا پیچھا کرتا ہوا کبھی گھاس میں چھپتے مینڈکوں کو بھگاتا ہوا گیٹ سے باہر نکل جاتا جہاں چنار کے بہت سے پیڑوں کے پرے جھیل نظر آتی تھی۔ وہ وہاں پہروں ایک جگہ کھڑا جھیل کو دیکھتا رہتا۔ یا چنار کے بڑے سے تنے پر چھوٹا سا ہاتھ دھر کر گول گول گھومتا۔ یا اس کے کھوکھلے تنے میں چھپ کر مجھے تلاش کرنے کو

پکارتا۔ میں کتنی بار اندر چلی جاتی کہ پیچھے پیچھے آتا ہوگا مگر مجھے پھر باہر آنا پڑتا اس کی تلاش میں۔
اور اسے اپنی دھن میں مگن ہری ہری گھاس پر لیٹا ہوا نیلے نیلے آسمان کو تاکتا ہوا پاتی۔ وہ
صبح سے شام کر دیتا کہ پرندے بولنے لگ پڑتے۔ کئی طرح کے پرندے چناروں کی اونچی نیچی
شاخوں پر آ بیٹھتے اور اپنے اپنے آشیانوں میں شب بھر چھپ جانے سے پہلے ان ٹہنیوں پر
سستاتے چہکتے ایک لطیف شور برپا کر دیتے۔ اور وہ ان میں کھو جاتا۔ مجھ سے ان کے نام پوچھتا
اور یاد رکھتا یہ بلبل ہے، یہ پپیہا ہے، یہ کستوری ہے، یہ ابابیل ہے، یہ فاختہ ہے یہ مینا ہے...
اور ہر پرندے کی بولی پہچان لیتا اور ہو بہو نقل اتارتا۔ جب کوئی پرندہ نیچے کی ٹہنیوں سے
اڑ کر اوپر گھنی شاخوں میں کہیں گم ہو جاتا تو وہ پہروں گھوم گھوم کر اسے تلاش کرتا۔
کوئی نیل کنٹھ پاس کی جھیل سے اپنی لمبی نیلی چونچ میں کوئی تڑپتی ہوئی روپہلی مچھلی آڑھی دبوچ کر
لاتا اور اسے سیدھی نگل جانے کی دھن میں بار بار اگلنے لگتا اور ناکام ہو کر کسی اونچی موٹی سی ٹہنی
پر اسے پٹخ پٹخ کر کھاتا تب وہ اندر سے بھاگ کر اپنی ننھی سی دوربین اٹھا لاتا اور باقاعدہ
مشاہدہ کرتا۔ مجھے بھی اس کے ذہین بھول پن کو نہارنے کے علاوہ اور کسی کام میں لطف نہ آتا۔
اس کے ایسے ہی بھول پن اور محویت کا فائدہ اٹھا کر میں اسے کھلا پلا دیتی ورنہ فطرت کے
اس پرستار کو میں باہر سے اندر لانا اگر بھول جاتی تو وہ کہیں باہر ہی سو جاتا، چاند کو سوچتا ہوا
تاروں کو دیکھتا ہوا۔ اور صبح جب اسے شبنم جگاتی تو شاید وہ پھر کسی ہدہد کو مٹی کی ننھی ننھی ڈھیریوں
میں سے چھوٹے چھوٹے کیڑے ڈھونڈتے ہوئے دیکھنے میں کھو جاتا۔

وہ کہیں شہر سے باہر جاتے تو فون پر اسی کی باتیں کرتے مجھ سے۔ ہماری زندگیوں
کا حصہ بن گیا تھا وہ۔ ذہین بے انتہا تھا وہ، یادداشت غضب کی۔ موسیقی کا دلدادہ ایسا کہ کسی
دن ڈھول میں اٹا ستار کا غلاف اتار کر میں اسے بجانے لگتی تو دیکھتی کہ وہ بغیر تھکے تقریباً
پون گھنٹہ اپنے ہی انداز میں اپنا ایجاد کیا ہوا کوئی رقص کرتا۔ اس کے ننھے منے ہاتھ پیر نہ تھکتے۔
کبھی ایک ٹانگ آگے کو جا رہی ہے کبھی پیچھے کو۔ کبھی سامنے کے تکیے پر ایک آدھ لات رسید کی
جا رہی ہے پھر کبھی ایک ٹانگ سے کبھی دونوں ٹانگوں سے کودا جا رہا ہے۔ دونوں ہاتھ ہوا
میں لہرائے جا رہے ہیں۔ سر بائیں کو مڑتا پھر تھوڑی دیر بعد دائیں کو۔ اور اس طرح کی ہر

حرکت میں یہی دیکھتی کہ ایک ردھم ہوتا۔ وہ جھوم جھوم جاتا۔ پسینہ پسینہ ہوجاتا۔ میں دیکھ دیکھ کر ہنستی پھر ستار چھوڑ کر اسے گود میں بھر لیتی۔ وہ حیرت سے دیکھتا کہ آخر ایسا کیوں؟ پھر اور بجانے کی ضد کرتا۔ میں بہلانے لگتی:

"ذرا آنکھیں بند کرو۔" وہ آنکھیں میچ لیتا۔

"یہ لمبی پلکیں کہاں سے لائے؟"

"باجار سے۔" وہ بھول پن سے جواب دیتا۔

"کتنے میں ــــ؟"

"دو روپے میں۔" وہ آنکھیں پھیلا کر ابرو اٹھا کر دو پر زور دے کہتا۔ یہ بھولی بھالی باتیں مجھے زندگی کا احساس دلائے رکھتیں۔ اس کی آمد سے میرا ذہنی تناؤ دور ہوگیا تھا۔ اللہ نے میری گود بھری۔ وہ کچھ بڑا ہوا تو اسکول میں داخل کروادیا گیا۔ اب وہ صرف WEEK ENDS پر آتا۔ پھر سال بھر بعد ہمارا ٹرانسفر ہوگیا۔ ہم وہاں سے چلے آئے۔ اس کی جدائی کا غم پتھر کی سل کی طرح سینے پر رکھا تھا۔ میں نے ہمیشہ اسے پہلوٹھی کے بیٹے کی طرح چاہا اور اس سے الگ ہوکر اس کے لیے ایسے ہی تڑپی جیسے ماں بچے سے بچھڑ کر تڑپتی ہے۔ اسی نے تو اپنے بچپن کو پہلے پہل میری گود میں جگہ دی تھی۔ مجھے ممتا اور محبت سے آشنا کرایا تھا۔

وہ بھی ہم دونوں کو برابر یاد کرتا۔ ہم سے ملنے کو مچلتا۔ فون ہی کچھ تسلی تھا دل کو۔ کافی دیر بات چیت چلتی میں فون پر کہتی "ذرا آنکھیں بند کرو۔" وہ فوراً آنکھیں بند کرتا میں پوچھتی کہ یہ پلکیں کہاں سے لائے تو ویسی ہی سنجیدگی سے کہتا کہ باجار سے۔ دو روپے میں۔ اس کے چھوٹے دماغ میں یہ خیال نہ آتا کہ میں تو اس کی بند پلکوں کو دیکھ ہی نہیں سکتی۔ اس کی امی مجھے بتایا کرتی۔

پھر ایسے ہی دو تین سال گزر گئے۔ کبھی فون CONNECT ہوتا کبھی کئی دن گزر جاتے۔ میرے دل سے اس کی محبت ذرا بھی کم نہ ہوئی۔ اس کی یاد میں میری آنکھیں بھر آتیں چھلک جاتیں۔ دل اسے ایک نظر دیکھنے کو تڑپ اٹھتا۔ باہیں اسے سینے سے لگانے کو

مچلتیں۔ روح جدائی کے غم سے درد کرتی۔ اور میں دل پر پتھر رکھ لیتی۔ اپنے بچوں میں صبر ڈھونڈ لیتی۔ کہ صبر کرنا میں نے اسے پا کر ہی تو سیکھا تھا کب سے، ہم بھی اور وہ لوگ بھی ملنے کا پروگرام بنانا چاہتے تھے۔ اور ملاقات تھی کہ طے ہی نہ ہو پاتی تھی۔ کچھ یہاں کا موسم کچھ ادھر کے حالات ــــ

اب کے سردیاں شروع ہوئیں تو وہ لوگ سچ مچ ہی آ گئے۔ مجھے تو انھیں دیکھ کر یقین ہی نہ آیا۔ اس کا قد تھوڑا سا لمبا ہو گیا تھا۔ تتلاہٹ ختم ہو گئی تھی۔ پہلے سے کچھ کم گو ہو گیا تھا۔ مگر دیکھنے میں ویسا ہی پیارا۔ دل موہ لینے والی صورت۔ کالی کالی بھولی سی آنکھیں۔ لمبی گھنی پلکیں۔ سیب ایسے گال اور لال لال کان۔ ہاتھ پاؤں وہی گورے، مکھن کے پیڑوں ایسے۔ مجھ سے لپٹا تو میں رونے ہی لگ پڑی اور وہ کتنی ہی دیر ہنستا چلا گیا۔ میں نے ہچکیاں لیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "ذرا آنکھیں بند کرو" اس نے آنکھیں جھکا لیں۔ میں نے پوچھا یہ پلکیں کہاں سے لائے تو شرما کر مسکرا دیا۔ میرے گھر میں بہاریں آ گئی تھیں۔ گھر میں کھانا اسی کی پسند کا بنتا۔ میں اسے طویل DRIVE پر لے جاتی۔ میرا سارا وقت اس کا ہو گیا تھا۔ مجھے میری گم گشتہ جنت مل گئی تھی۔

ایک دن صبح صبح گولیاں چلنے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ بھاگی بھاگی باہر نکلی تو دیکھتی ہوں کہ وہ بالکنی میں کھڑا منہ سے مختلف قسم کی گولیاں چلنے کی آوازیں نکال رہا تھا۔ ایسی مہارت سے کہ ان کے نقلی ہونے کا شک تک نہ گزرے۔

یہ سارا قصور میرا ہی تھا۔ وہ کتنے دن سے آیا تھا اور میں نے اس کے لیے ایک بھی کھلونا نہیں لیا تھا۔ اسی دن شام کو میں اس کی پسند کے کھلونے خرید لائی۔ جب وہ سو گیا تو میں نے وہ سارے کھلونے اس کی مسہری پر سجا دیے کہ صبح جاگتے ہی دیکھے گا تو کتنا خوش ہو گا۔ دوسرے دن اتوار تھا۔ میں ذرا دیر سے جاگی۔ دیکھا کہ سارے کھلونے ایک طرف کو ایک ڈھیر کی شکل میں رکھے ہوئے ہیں۔ اور وہ غائب۔ میں نے اس کی امی سے پوچھا تو بولیں کہ سب بچے بڑے کمرے میں کھیل رہے ہیں۔

بڑے کمرے کے دروازے پر اس کی ننی سی بہن ہونٹوں پر انگلی رکھے پہرا دے رہی تھی۔

"شی ــــ ادھر نہیں جانا۔ فائرنگ ہو رہی ہے۔" وہ مجھے خبردار کرتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔ اندر جھانکا تو عجیب منظر دیکھا۔ سارے گھر کے تکیے اور سرہانے ایک کے اوپر ایک اس طرح رکھے ہوئے تھے جیسے ریت کی تھیلیاں رکھ کر مورچے بنائے جاتے ہیں۔ وہ درمیان میں اوندھا لیٹا ہوا ایک بڑی سی لکڑی کو بندوق کی طرح پکڑے منہ سے مختلف طرح کی گولیوں کی آوازیں نکال رہا ہے۔ اور اس کے دائیں بائیں میرے دونوں بیٹے اپنی پرانی چھوٹی بندوقیں لیے ہوئے اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔ وہ جیسے حکم کرتا وہ دونوں ویسا ہی کرتے کبھی ایک بھاگ کر ایک کونے میں گھستا، کبھی دوسرا دوسرے کونے میں یہ ہی عمل دہراتا۔ کبھی ایک بک ریک کی آڑ میں ہو کر دوسری طرف کودتا۔ کبھی دوسرا الماری کے پیچھے چھپ کر، جست لگا کر دیوار کے ساتھ چپک جاتا۔ اور وہ خود مورچہ سنبھالے کبھی ان کو ہدایت کرتا کبھی ان پر بندوق تان دیتا۔

اب یہ ہی اس کا پسندیدہ کھیل تھا۔

وہ میٹھی بولیاں، وہ رقص، وہ موسیقی ــــ بھول گیا تھا اور وہ سب یاد دلانے کے لیے میں شاید اسے کہیں نہیں لے جا سکتی تھی۔

پورٹریٹ

"ارے بھئی کہاں ہیں آپ! ذرا دیکھیے تو کیا لائے ہیں ہم"۔ میرے شوہر گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی مجھے بلانے لگے۔ جب میں ان کے قریب پہنچی تو انھوں نے اپنی والدہ مرحومہ کا بڑا سا پورٹریٹ دکھایا، جس کا نیگیٹو NEGATIVE وہ کچھ دن پہلے اپنی ہمشیرہ کے ہاں سے لائے تھے اور اب انھوں نے اسے ENLARGE کر کے بڑے ٹی۔ وی کے سکرین کے برابر DEVELOP کرا لیا تھا۔ فوٹو میں صرف چہرہ اور شانے تھے۔ یعنی انسانی جسامت سے بھی بڑی تصویر" اسے ہم —— یہاں —— ہاں —— ادھر لٹکائیں گے۔ تاکہ روز نیند سے بیدار ہوتے ہی اس تصویر پر ہماری نظر پڑے اور اپنی اماں کا منہ دیکھ کر ہم اپنے دن کا آغاز کریں۔ کہیے۔ کیسا رہے گا۔ ہے نا کیا عمدہ خیال ہے؟"
انھوں نے کچھ خوش ہو کر کچھ فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھ کر کہا اور ہماری مسہری کے ٹھیک سامنے اسے دیوار پر ٹانکنے کی جگہ تلاش کرنے لگے۔ وہ بھی دیوار سے اس قدر قریب جا کر جیسے دیوار کو سونگھ رہے ہوں۔ یعنی دیکھ لیجیے کہ اس کام میں ہم کس قدر منہمک ہیں۔ اور میں سوچ رہی تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور کچھ سمجھ میں نہ آنا میرے لیے کوئی نئی بات نہ تھی کہ جب سے ان حضرت نے مجھ سے نکاح فرمایا تھا تب سے باتوں نے میری سمجھ میں آنا چھوڑ دیا تھا کہ اس گھر کی مخصوص "سیاست" مجھ ایسی "غیر سیاسی" شخصیت کی عام سی سمجھ سے بالاتر تھی۔ یوں تو ہر گھر کی اپنی الگ سیاست ہوتی ہے مگر اکثر حالات میں

ہر نئی بہو کو اسے سمجھنے میں کچھ زیادہ وقت نہیں لگتا۔ مگر میرے ساتھ ایسا نہ ہو سکا۔ میں نے لاکھ جتن کیے مگر میری سمجھ میں وہ اشارے، وہ نگاہوں کے پیغام نہ آسکے جو میری خلیا ساس، ممیا ساس، جو پاس پاس رہتی تھیں اور زیادہ وقت ہمارے ہاں ہی گزارتیں، اور میری جٹھانی صاحبہ ایک دوسرے سے بدل بدل کر میری ساسو امّی تک پہنچاتیں۔ یعنی ہر ایک کے پاس بیک وقت ٹرانسمیٹر بھی رہتا اور ریسیور بھی اور لہریں ادھر سے ادھر سفر کرتی رہتیں۔ بس اتنی بات میری سمجھ میں نہ آتی کہ وہ مثبت اور منفی دونوں ہی طرح کے پیغامات کو ایک ہی طرح کے اشاروں کے ذریعے کس طرح منتقل کرتیں اور اشارے بھی وہ جو اشارے ہو کر بھی واضح اشارے نہیں تھے۔ بس نظریں تھیں۔ آنکھوں کی پتلیاں تھیں، جو دائیں جاتیں، بائیں جاتیں اوپر ہوتیں پھر نیچے۔ بس صرف وقفوں میں کچھ فرق ہوتا یعنی اگر پتلی بائیں جانب لمحہ بھر رُکی تو پھر یکلخت درمیان میں آکر نیچے جھک گئی۔ یا کبھی سر بالکل سیدھا اور آنکھیں اطراف و جوانب کا طواف کر رہی ہیں۔ پیغامات آجا رہے ہیں۔ ساسو امّی فیصلے صادر فرما رہی ہیں۔ یقیناً زبان سے نہیں۔ اگر مطمئن ہیں تو دور دیکھ رہی ہیں اور خاموش تو ہیں ہی، اور اگر کسی طرح سے بھی ناراض یا ناخوش ہیں تو ان کا بایاں ابرو اوپر کو کھنچا ہوا ہے۔ اور بائیں نتھنے کی گولائی سے ہوتی ہوئی ایک لکیر ہونٹوں کے بائیں کونے کو خم دیتی ہوئی نیچے ٹھڈی تک جا رہی ہے۔ ایک نظر میرے پیروں پر پھینکی جا رہی ہے اور دوسری ان تین محترماؤں پر۔ مگر پھر بھی مجھے کہیں کہیں سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ مجھ سے کم ناراض ہوں اور ان کو خوش زیادہ کر رہی ہوں۔ کہ بڑی بڑی وہ غلافی آنکھیں کچھ زیادہ دیر بے تاثر نہ رہتی تھیں۔ ان میں نرمی کی ہلکی سی جھلک آہی جاتی تھی جسے وہ کمال خوبی سے ادھر ادھر دیکھ کر چھپا لیتی تھیں۔ اور میرا جی چاہتا کہ ان سے کہہ دوں، میری پیاری ساسو جی ان کا کہا مت سنا کیجیے۔ میں آپ کی بہن، بھابھی یا بھانجی نہ سہی، آپ کی بہو تو ہوں۔ بہت سے خواب لے کر آئی ہوں۔ آپ کو اپنی امّی کی طرح چاہنا چاہتی ہوں۔ ذرا سا مجھ کو بھی اپنوں میں شمار کر لیجیے۔ مجھے نظروں کی زبان سکھائیے تو نہ سہی کہ وہ میرے ہی خلاف تو ایجاد ہوئی ہے اور جب رازداری ہی مجھ سے ہے تو میں ہمراز ہو جانے کی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کا خیال کرنے کی جسارت کیسے کر سکتی ہوں، آپ

براہِ کرم اتنا رحم کردیجیے کہ میرے خلاف، میری امی جان، کوئی بھی رائے قائم کرنے سے پہلے ان محترماؤں کا مفت مشورہ نہ طلب فرمایا کریں، دیکھیے ان کو تو مجھ سے خدا واسطے کا بیر ہے کہ ممانی صاحبہ اپنی کھنکھجورے جیسی لمبی دبلی سانولی دخترِ نیک اختر کو میری جگہ دلوانے میں ناکام ہوگئیں تو اس میں میری کیا خطا ہے (آپ کی ہوگی) اور خالہ جانی کی چھوٹے منہ بڑی بات والی میرا مطلب ہے چھوٹے سے منہ اور بہت بڑے دانتوں والی نوویں درجے میں پاس اور دسویں میں فیل، کو میرے اچھے خاصے سکالر خاوند کے ساتھ بیاہنا چاہتی تھیں تو میرا کیا قصور۔ مجھے تو تقدیر نے پھانس لیا۔ میرا مطلب ہے باندھ دیا اور آپ کی لاڈلی بھانجی صاحبہ اپنے شوہر سے چار پانچ برس بڑی ہیں اور میں اپنے میاں سے چار پانچ برس چھوٹی ہوں تو ان کی صحت پر کیا اثر۔ خیر چھوڑیے ان باتوں کو بس آپ اتنا کر دیجیے کہ ان خواتین کے ساتھ لنگاہوں کی بولی نہ بولا کیجیے۔ واللہ یہ سب ہمارے گھر کا سکون خراب کیے دے رہی ہیں میری اچھی ساسو امی! مان جائیے نا ——

مگر میں یہ جرأت کبھی نہ کرسکی۔ انھوں نے میری طرف ان نظروں سے دیکھا ہی نہیں جن سے دوستانہ ہمت حاصل کرکے میں کبھی ان کے ساتھ ہلکے پھلکے انداز میں بات کرپاتی۔ جب بھی میں نے ان سے کوئی بات کی مجبوراً کی۔ ڈر ڈر کر کی، تب کی جب اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ رہا ہو ورنہ ان کے خاموش چہرے اور اِدھر اُدھر کو دیکھتی ہوئی سرد لنگاہوں کی مجھ پر ایسی ہیبت طاری رہتی کہ ضروری بات بھی میں ادھوری ہی کرپاتی۔ ایک واقعہ بھی تو یاد نہیں جب انھوں نے مجھ سے دل کھول کر بات کی ہو۔ بات ہی کی ہو۔ دل کھول کر نہ سہی۔ ویسے بھی وہ خاموش طبع واقع ہوئی تھیں۔ میں نے انھیں بولتے بھی کم ہی سنا تھا۔ کبھی آہستہ آہستہ، دھیمی آواز میں۔ وہ بھی اپنے بچوں یا شوہر کے ساتھ نہیں اپنے مائیکے والوں کے ساتھ۔ باقی لوگوں کے ساتھ وہ ایک آدھ جملے میں اپنی رائے ظاہر کرتیں یا معاملہ طے کرتیں۔ مگر میں ان میں بھی نہیں آتی تھی۔ انھوں نے اپنے اطراف فصیل چن رکھی تھی اور ایک حد کے بعد (وہ حد جو میرے ایک قدم چلنے کے بعد شروع ہوجاتی) ان تک رسائی ناممکن تھی۔ دور سے کبھی ہوں یا ہاں کرلیتیں

جب آپ ان سے مخاطب ہوں اور اردگرد حسبِ معمول ان کی پسندیدہ خواتین
کا دائرہ ہو تو وہ ایسی نگاہوں سے آپ کی طرف دیکھیں گی کہ ان کی نظریں خنجر کی طرح آپ کے
کلیجے میں اتر جائیں جیسے آپ اپنا جرم بیان کر رہے ہوں اور وہ آپ کو زہر میں بجھی نظروں سے
دیکھ دیکھ کر احساسِ جرم کے جذبے سے ہلاک کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ بیچ بیچ میں گردن
کو اپنی دائیں اور بائیں جانب گھما گھما کر اپنی پسندیدہ شخصیات سے نظریں بھی مل رہی ہوں اور
پھر سیدھی سادی بات کا جواب بھی کہاں سیدھا دیتیں۔ بس سر کو ذرا سا نیچے کو ہلا دیتیں یا
پھر کندھے کی طرف۔ صرف ایک بار۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ جواب ہی نہ دیں۔ اور یہ رازِ حقیقت
جاننے میں مجھے دو ڈھائی سال تو لگ ہی گئے، مگر اس کے علاوہ میں اور کچھ بھی سمجھ نہ پائی۔
لفظوں کو نظروں میں پرونا مجھے نہ آیا۔ نہ میں ان تک رسائی حاصل کر سکی نہ انھوں نے
مجھے قریب ہونے دیا۔ تماش بینی اور رشتوں کو توڑنے کے نئے تجربوں کے
پرانے ہتھیاروں سے لیس ہو کر ان کی عزیزاں گھر کے متوقع سکون کو میدانِ جنگ کی دہشت
میں نہ بھی تبدیل کر پاتیں مگر سازش کا اڈہ بنا ہی دیتیں۔ اور ان کے گٹھ جوڑ سے
اپنے گھر کو جسے آج بھی اپنا کہنے میں مجھے دو گھورتی ہوئی آنکھیں جانے کیسے روک دیتی
ہیں، میں کبھی اپنا گھر نہ محسوس کر سکی۔ ایسے کتنے ہی دل دکھانے والے واقعات ہیں۔

مجھے یاد ہے، میری شادی کو سال بھر ہوا تھا اور ایک نوجوان بھکارن اپنے نوزائیدہ بچے
کو گود میں لیے کچھ کھانے کو مانگ رہی تھی کہ فاقے کی وجہ سے اس کے جوان جسم میں بچے کو
پلانے کے لیے دودھ نہ اترا تھا اور وہ اس بات کو دہرا دہرا کر کچھ پیٹ بھرنے کو مانگ
رہی تھی۔ میں نے رات کی بچی ہوئی روٹیوں کو اخبار میں لپیٹ کر ساتھ میں کچھ اچار رکھ کر
اس کو دینا چاہا کہ جانے کہاں سے میری خلیا ساس چیل کی طرح جھپٹ کر وہ روٹیاں چھین کر
ساسو امی کے سامنے پیش کرنے کے لیے لے گئیں۔ میں مجرم کی طرح سر جھکائے ان کے
پیچھے پیچھے حاضر ہوئی۔ انھوں نے نظروں کی زبان سے بات سمجھ لی اور زندہ نگل جانے والی
ایک نگاہ مجھ پر ڈال کر روٹیوں کو ان کے ہاتھ سے لے لیا یعنی کہ اس گھر کی بہو جس گھر کو اوپر
والے نے ہر نعمت سے نوازا تھا، ایک بھکارن کو روٹیاں دے کر اپنا مالکانہ حق جتانے چلی تھی۔
اس اثنا میں میری ممیا ساس اور جٹھانی صاحبہ بھی وہاں آدھمکیں اور مجھے حقارت بھری

نظروں سے دیکھنے لگیں، یوں جیسے کہہ رہی ہوں کہ کہیں اور سے آنے والی اجنبی عورت تجھے یہ حق کس نے دیا کہ تو خود کو مالک سمجھنے لگی۔ پھر ساسو ماں نے وہ اخبار کھول کر بچھایا اور اس پر ان روٹیوں کے ننھے ننھے ٹکڑے بنانے لگیں، جو چڑیاں آسانی سے چگ سکیں۔ اور جیب سے بیس روپے کا ایک نوٹ نکال کر جٹھانی جی کو دیا کہ وہ بھکارن کو دے آئے اور جٹھانی صاحبہ کئی قدم آگے بڑھنے کے بعد گردن کو مکمل طرح پیچھے گھما کر ایک لعنت بھیجنے والی نظر مجھ پر ڈالتی ہوئی باہر گئیں اور باقی حاضرین فاتحانہ نظریں ایک دوسرے سے بدل بدل کر، مجھ پر تحقیر کے پتھر پھینکنے لگے۔ مگر میں تو کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ یہی کہ میرا مقصد بھکارن کی مدد کرنا تھا وہ تو پورا ہو گیا۔ اور اب میں ان بھاری طلائی کڑوں سے سجے اُن بھرے بھرے گورے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی جو نہایت انہماک اور لگن سے روٹیوں کو ننھے ننھے ٹکڑوں میں بانٹ رہے تھے۔ سر جھکا ہوا تھا اور چہرہ غضبناک دکھائی دے رہا تھا۔ غور سے دیکھنے پر مجھے ان کے چہرے پر مبہم سی مسکراہٹ بھی دکھائی دی اور تب تک یہ مسکراہٹ قائم رہی جب تک کہ ہماری خلیا ساس نے آگے بڑھ کر دانے باہر بکھیرنے کے لیے اپنی خدمات پیش نہیں کیں۔ انھوں نے سر اوپر اٹھایا ارد گرد سب پر اور پھر مجھ پر نظر ڈالی اور نگاہوں میں سختی بھر کر دوبارہ چہرے پر کرختگی اوڑھ لی جسے دیکھتے ہی میں اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے وہاں سے ہٹ گئی مگر آج میں نے ان میں ایک نئے ایک الگ انسان کی جھلک دیکھی تھی۔

ممتا سے بھری رحم دل عورت کو دیکھا تھا جو اپنے میں کوئی الگ تھیں۔ بالکل الگ۔ مگر گرد و پیش کا جن پر ایسا اثر ہوتا کہ وہ اپنی شخصیت کو جانے کہاں چھپا کر جانے کون بن جاتیں۔ ایک روایتی ساس، جو ادھیڑ عمر میں بھی مائیکے والوں کی سن سن کر ان ہی سا کرتیں۔ مجھے آج یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ اگر کبھی وہ اکیلی ان محترماؤں میں نہ گھری ہوتیں اور یہ محترمائیں کبھی ہم دونوں کو ہمارے حال پر چھوڑ دیتیں تو ضرور ہم ایک دوسرے کے قریب ہوتے ایک دوسرے کو جانتے سمجھتے۔ وہ بھی یہ سمجھ جاتیں کہ یہ غیر لڑکی جوان کی بہو ہے، ان کی محبت کی کس قدر طلب گار ہے۔ انھیں کتنا اپنا سمجھتی ہے۔ انھیں کتنا سکھ اور سکون دینا چاہتی ہے اور دے سکتی ہے۔ مگر ایسا موقع کبھی نہیں آیا اور میرے اندر ان کا قہر آلود امیج جوں کا توں قائم رہا۔

اور آج ہمارے میاں جو تصویر بڑی کر کے لائے تھے اس میں ان کی بہت بڑی بڑی قہر برساتی ہوئی آنکھیں تھیں اور وہی سپاٹ چہرہ لیے کیمرے کو گھور رہی ہیں یا شاید دیکھ رہی ہیں اور مجھے ہی گھورنے کا وہم ہو رہا ہے کہ میں نے ان کی سیدھی نظر جب دیکھی تو خود کو گھورتی ہوئی ہی دیکھی تھی۔ آنکھوں میں تیر کی طرح چبھتی ہوئی، سینے میں خنجر کی طرح اترتی ہوئی۔ جس سے نظر ملتے ہی میرا دل سو طرح سے دھڑکنے لگتا تھا۔ جس کا عتاب مجھ پر بارہا قہر بن کر ٹوٹا۔ جس نے میرے اور میرے شوہر کے درمیان ان دیکھی خلیجیں تعمیر کیں جنھیں میں صبر سے اور داتا کے کرم سے نہ پاٹتی تو شاید آج یہ ذکر نہ چھڑتا۔ بس۔ جیسے کہ انھیں مجھ سے کوئی خدا واسطے کا بیر ہو۔ یا پھر میری ان کی کوئی پرانی دشمنی ہو۔ یا پھر ان کی مرضی کے خلاف یہ شادی ہوئی ہو۔ ہاں ہو سکتا ہے تیسری بات ہو شاید کہ وہ براہِ راست کسی سے کچھ کہتی نہ تھیں۔ اور جب حالات نے مجھ سے رشتہ جوڑنے کی طرف رُخ کر لیا ہو تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی کسی بھانجی بھتیجی کو بہو بنا کر لانا چاہتی ہوں اور بروقت کچھ نہ کہہ پائی ہوں اور میرے بارے میں بادلِ نخواستہ ہاں کر دی ہو اور وہی دبا ہوا احتجاجی جذبہ اب قہر بن کر مجھ پر ٹوٹ رہا ہو۔ آگ بن کر میری چاروں طرف پھیل رہا ہو کہ ہوا دینے والیاں کہانیوں میں بسنے والے بڑے بڑے کریہہ پنکھوں والے چمگادڑوں کی طرح اپنے مکروہ سائے لیے ہر وقت بدروحیں بن کر اُن کے آس پاس منڈلاتی رہتی تھیں۔ انھیں جانے کیا کیا کہتیں، کیا کیا پڑھاتیں، کون کونسی اختراعات گڑھ گڑھ کر بیان کرتیں اور وہ بھی مجھ سے بغیر کچھ کہے کچھ پوچھے یک طرفہ فیصلے کر کے جانبدارانہ طریقے سے عمل پیرا ہوتیں۔ میں خاموشی کو تقدیر سمجھ کر سہہ لیتی۔ غیریت کا زہر پی لیتی اجنبیت کے کفن میں لپٹی زندہ رہتی اور وقت ساکت و جامد گزرتا رہتا۔ مگر پھر بھی مجھے اپنے لیے ان کی اس مسکراہٹ کا ہمیشہ انتظار رہا جو ممتا اور محبت بھرے ہاتھوں سے روٹیوں کے ننھے ٹکڑے بناتے وقت ان کے چہرے پر میں نے دیکھی تھی مگر ساتھ ہی زہر میں بجھے ہوئے تیر کی طرح جسم سے آر پار ہوتی ہوئی دو جابر و قاہر آنکھیں بھی میرے ذہن پر ڈراؤنے خواب کی طرح چھائی رہتیں۔ یہ میرا اپنا ٹینشن تھا۔ اس میں میری کوئی مدد نہ کر سکتا تھا۔ یہ میری قسمت تھی ورنہ میرے میاں تو میرے مائکے والوں کے سب سے لاڈلے داماد تھے۔ میری امی انھیں سگے بیٹے کی طرح عزیز رکھتیں بلکہ جان سے زیادہ پیار کرتیں۔ وہ انھیں بیٹے

ہی کی طرح چھیڑتیں، سمجھاتیں، مذاق کرتیں، بالکل ایک دوستانہ انڈرسٹینڈنگ تھی ان کے درمیان۔ ابّو بھی ان پر جان چھڑکتے تھے۔ ہر بات میں ان سے مشورہ کرتے گو کہ یہ ان کی ہر بات کا جواب ان ہی کی ہر خواہش کے مطابق دیتے، مگر ابّو ان سے پوچھتے ضرور۔ ابّو ائرفورس میں پائلٹ رہ چکے تھے۔ ان کی پوری شخصیت بارعب تھی اور پڑھے لکھے اور عالم بھی تھے۔ کسی بھی موضوع پر گھنٹوں بول سکتے۔ جہاں دیدہ اور تجربہ کار۔ اور ہمارے میاں حضور ان کا بے حد احترام کرنے کے ساتھ ساتھ ان سے دبتے بھی تھے۔ یہ بات صرف میں نے محسوس کی تھی۔ وہ تو الٹا مجھ سے یہ کہتے کہ تمھارے والد صاحب سے گفتگو کرنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ ان کے پاس سے تو اٹھنے کا دل ہی نہیں کرتا۔ اور حقیقت میں جانتی تھی۔ یہ سب وہ صرف مجھ سے اپنی خفت چھپانے کے لیے کہا کرتے تھے۔ گو کہ وہ خود بھی اچھے مفکّر و مقرر تھے مگر ابّا کے سامنے وہ کسی بچّے کی طرح خاموش ہو جاتے۔ حالانکہ ابّو نے نہ کبھی ان سے کوئی سوال کیا نہ بحث کی دعوت دی بس اپنے علم کے خزانے سے اپنے معلومات کے موتی بکھیرتے اور یہ ہمہ تن گوش سنا کرتے مگر ان کی کسی نہ کسی حرکت سے میں یہ سمجھ جاتی کہ یہ جو بظاہر صبر و تجسس کی تصویر بنے ان کی گفتگو میں اس قدر منہمک ہیں دراصل وہاں سے اٹھ جانے کو کس قدر بے قرار ہیں اور ایسے میں میری ہنسی چھوٹ جاتی۔ اور میں ہنسی دبائے چائے یا کافی لے جاتی کہ انھیں وہاں کچھ دیر اور رکنا پڑے اور یہ میرے سامنے اقرار تو کر لیں کہ میرے والد صاحب سے یہ حضرت دبتے بھی ہیں۔ مگر یہ ذکر وہ کبھی زبان پر نہ لاتے لیکن ان کی آنکھیں اس وقت صاف کہہ رہی ہوتیں کہ یہ ہی وقت ملا تھا چائے لانے کو۔ پھنسوا دی نا میری گردن کچھ دیر اور۔ ان کی آنکھوں کے ان تاثرات کو میں دیکھتی تو ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتی۔ مگر مجال کہ کبھی منہ سے کچھ کہہ دیں۔ یہ ہی کہتے کہ "تمھارے خاندان میں اگر کوئی پڑھا لکھا ہے تو تمھارے والد۔ مجھے ان کی صحبت میں وقت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ حالانکہ دیکھنے میں وہ سوائے ایک فورسز کے آفیسر کے اور کچھ نہیں لگتے۔ انھیں اپنا حلیہ عالموں جیسا رکھنا چاہیے۔ سب سے پہلے ان بھاری بھوٹوں اور سرخ آنکھوں کو چشمے سے ڈھک دینا چاہیے۔ پھر یہ مونچھیں جو ہر وقت اوپر کو مروڑ کر رکھتے ہیں، کیسی عجیب لگتی ہیں ——— ہیں نا ——— تمھیں نہیں لگتا ——— اچھا خاصا

آدمی ڈراونا سالگتا ہے۔ تم کیا کہتی ہو ــــــ" وہ میری رائے طلب کرتے ــــــ" مجھے تو بالکل نہیں لگتا۔ ہاں آپ کو ڈر محسوس ہوتا ہو تو میں ان سے کہہ دیتی ہوں کہ وہ مونچھیں چھوٹی کر کے سیدھی کر لیں۔ ہمارے میاں کو خوف آتا ہے۔" میں عام سے لہجے میں کہتی ہوئی فون کی طرف بڑھتی اور وہ گھبرا کر میرا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیتے۔" ارے رکو تو ــــــ میں تو بس یوں ہی کہہ رہا تھا۔ کوئی بچہ ہوں جو مونچھوں سے ڈر جاؤں" ــــــ وہ مصنوعی ہنسی ہنستے اور مجھے سچ مچ ہنسی آجاتی۔ وقت گزرنے سے پہلے محسوس ہوتا ہے کہ بہت زمانہ لگے گا گزرنے میں۔ اور جب برسوں گزر چکے ہیں تو تعجب ہوتا ہے کہ یہ وقت تو بس لمحوں میں گزر گیا جیسے ہم برس گنا کرتے تھے۔ والد صاحب بھی وقت کے ہاتھوں ضعیف ہوئے۔ رحلت فرما گئے۔ ساسو امی بھی انتقال کر گئیں۔ خدا غریقِ رحمت فرمائے۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کے ہو گئے اور رہ گئیں یادیں۔ حال کی بنیاد ہم ماضی کے واقعات ہی سے تو رکھتے ہیں۔ ماضی میں جو ملا، بچھڑا، کھو گیا یا پاس رہا سب حال ہو جاتا ہے۔ اور حال یہ ہے کہ ہم بھی اپنی گرہستی میں مصروف و مسرور ہو گئے اور زندگی گزرنے لگی۔

میرے میاں آخر کار کیلوں والے ڈبے سے ایک لمبی سی کیل تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے اور ہتھوڑی لے کر دیوار کے درپے ہو گئے۔ انھوں نے کیل دیوار میں داغ دی اور جب میں نے ان کی والدہ صاحبہ کو ٹھیک اپنے سامنے دیوار سے اپنی طرف دیکھتا ہوا پایا تو ایکبار پھر برسوں کا بھولا ہوا لرزہ مجھ پہ طاری ہونے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ تھوڑی دیر بعد میں نے ذرا ٹھہر ٹھہر کر کہا۔" یہ تصویر یوں ہماری پائینتی کی طرف رکھ دی آپ نے۔ یہ تو بے ادبی ہوئی۔ یہ آپ نے کیا کیا۔ ایسا کرتے ہیں اسے نشست گاہ میں ٹانک دیتے ہیں۔ وہاں آپ کے والد صاحب کا بھی بڑا سا پورٹریٹ ہے وہیں اچھی لگے گی۔ ہے نا؟"

" ارے بھئی آپ بھی حد کرتی ہیں۔ البموں میں کیا کم تصویریں ہیں ان کی۔ یہ تو میں اس لیے یہاں رکھ رہا ہوں کہ اس میں بالکل جیتی جاگتی سی محسوس ہو رہی ہیں۔ ہے نا۔ ذرا غور سے دیکھیے۔ جیسے سچ مچ سامنے ہوں" "ہاں ــــــ وہ تو ہے ــــــ بلکہ جیتی جاگتی سے کچھ زیادہ ہی ــــــ" میں نے مری ہوئی آواز میں کہا

وہ آفس چلے گئے۔ میں دوپہر میں لیٹی تو گھبرا کر اٹھ بیٹھی کہ واقعی میرے پاؤں ان کی

طرف ہو رہے تھے میں نے سرہانا مشرق کی طرف رکھا اور لیٹنے لگی۔ مگر مغربی دیوار میں لگے بڑے سے آیئنے میں سے وہ مجھے بدستور گھورنے لگیں تو میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ نیند تو اڑ گئی تھی اب میں ذرا تفصیل سے مسئلے کا حل سوچنے لگی۔ اور سوچتے سوچتے ایک ایسا آیئڈیا دماغ کو چھو گیا کہ میں آپ ہی آپ مسکرا دی بلکہ ہنس دی۔

شام کو جب وہ آنے والے تھے تو کچھ دیر پہلے ہی میں بھی باہر سے لوٹی تھی۔ چائے کی میز پر میں نے ان کے سامنے ایک بڑا سا پیکٹ رکھ دیا۔

"بوجھیے تو جانیں کہ اس میں کیا ہے۔" میں نے لہجے میں پیار بھر کر کہا اور وہ بھی مسکراتے ہوئے اسے کھولنے لگے۔ اور کبھی کلنڈر میں کبھی گھڑی میں تاریخ دیکھنے لگے کہ نہ تو آج ان کا جنم دن تھا اور نہ ہماری شادی کی سالگرہ اور نہ کوئی تہوار۔ پیکٹ کھل چکا تو ان کی مسکراہٹ کافور ہو گئی۔" ارے —— یہ —— یہ ہاں۔ دیکھو کتنے اچھے لگ رہے ہیں" وہ کچھ کھسیا کر کہنے لگے۔

"میں جانتی تھی کہ آپ کو میرے ابّو کا یہ بڑا پورٹریٹ دیکھ کر بہت خوشی ہوگی۔ آپ نے کیلوں والا ڈبہ کہاں رکھا ہے۔ اسے بھی خواب گاہ میں ٹانگیں گے۔ ہیں نا۔ نیند سے جاگتے ہی والدین کا دیدار ہو تو پورا دن خوشی سے۔ کٹے گا کیا خیال ہے آپ کا۔" میں نے نہایت سادگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "اصل میں، میں صبح سے یہ سوچ رہا تھا کہ واقعی بزرگوں کی بڑی بڑی تصویریں بڑی سی نشست گاہ میں زیادہ اچھی لگیں گی۔ میرے خیال میں دونوں تصویروں کو ڈرائنگ روم میں ہی لٹکانا بہتر ہوگا۔ کیوں؟ ٹھیک ہے نا۔"

"اچھا۔ جو آپ مناسب جانیں۔"

ایک پہلو یہ بھی ہے ..... تصویر کا

وہ دونوں باری باری یا ایک ساتھ میری طرف دیکھ رہے تھے۔

جہاز کے اڑان بھرنے میں تقریباً ایک گھنٹہ باقی تھا۔ جامہ تلاشیوں اور سامان کی اسکریننگ میں کچھ زیادہ ہی سخت گیری برتی جا رہی تھی۔ خطاؤں کا چلن چل نکلتا ہے تو بے تقصیروں کو بھی آزمائشوں اور امتحانوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

والد صاحب کا سامان چونکہ نہایت مختصر تھا اس لیے وہ کافی پہلے اندر داخل ہو چکے تھے۔ کچھ وقت پہلے الوداع کرنے والوں کو دس روپے کے ایک ٹکٹ کے عوض اندر جانے کی اجازت تھی مگر اب وہ آسائش میسر نہیں رہی۔ اس لیے ان کے اندر جاتے ہی ہمارا ان سے رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ استقبالیہ دالان کے سیاہی مائل سرمئی شیشوں کے اس پار کا ہمیں کچھ حال معلوم نہ تھا۔ مگر پھر بھی ہم منتظر تھے کہ شاید انھیں کچھ کہنا ہو ہم سے۔ یا وہ پل بھر کو باہر آجائیں یا گیٹ کے قریب آکر الوداعی انداز میں ہاتھ لہرائیں۔ تین برس بعد آئے تھے وہ اس بار معلوم نہیں پھر کب آئیں۔ زیادہ وقت یہاں رہتے نہیں تھے وہ۔ یہاں کا درجۂ حرارت انھیں موافق نہ آتا تھا۔ ٹھنڈی ہواؤں کے عادی جو تھے وہ۔ پھر انھیں اپنی جڑیں بھی عزیز تھیں۔ اس عمر میں اپنی مٹی سے قریب رہنا چاہتے تھے وہ۔ انھیں اپنی زندگی سے زیادہ اپنی موت کا خیال رہتا۔

وہ دونوں لگاتار میری طرف دیکھ رہے تھے۔ عورت نے باقاعدہ میری طرف سر سے اشارہ کر کے کچھ کہا تھا۔ اس پر مرد اور زیادہ غور سے میری طرف دیکھنے لگا۔ مجھے یہ سب شاید اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ حالانکہ جس طرح کوئی بھی انسان اپنے علاقے کے شخص کو کئی لوگوں میں شناخت کر لیتا ہے اسی طرح میں بھی پہلی ہی نظر میں جان گئی تھی کہ ان کا تعلق میری ہی مٹی سے ہے۔ یہ سرخ و سفید رنگت، یہ تیکھے نقوش، یہ چمکیلے سیاہ بال اور کہاں کے ہو سکتے ہیں کہ میرے علاقے کے لوگ دنیا کی حسین ترین مخلوق ہیں۔ جہاں نوجوان وجاہت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اور دوشیزاؤں کے چہرے ایسے ہوا کرتے ہیں جیسے دودھ سے بھری کٹوری کی سطح پر گلاب کا ایک پھول تیر رہا ہو۔

ان دونوں کے چہرے خاصے پرکشش تھے۔ بھاری جسم، ملبوسات قیمتی مگر رنگِ لباس ایسا کہ وہ سب کی نظروں میں سما جائیں۔ مرد کے سوٹ کے بٹن بڑے بڑے اور چمکیلے تھے اور عورت زیورات سے لدی ہوئی چہرے پر بہت سا میک اپ کیے۔ گو کہ آرائش کی اس بھرمار نے اس کی اپنی کشش کہیں چھپا دی تھی۔

بہرحال مجھے اس کی پسند پر نکتہ چینی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اس نے بڑے گل بوٹوں والا زرد اور قرمزی رنگ کا قمیص شلوار پہن رکھا تھا تو یہ اس کی مرضی، موٹے موٹے نگینوں والے بڑے آویزے کانوں میں پہنے تھے۔ سرخ لپ اسٹک کی دبیز تہ لگائی تھی۔ یہ اس کی اپنی خواہش تھی۔ مجھے بھی تو پھیکا پھیکا سا سفید رنگ بہت پسند ہے۔ اور پھر لباس اور رنگ ایک اضافی خواہش ہے کوئی بنیادی ضرورت نہیں۔ مگر جب بنیادی ضرورتیں ہی متاثر ہونے لگیں تو اضافی خواہشات کے لیے نہ تو فرصت ہوتی ہے نہ دلچسپی باقی رہتی ہے۔ اجڑے دیاروں کے مکین اپنی مرضی سے جیتے ہی کہاں ہیں۔ بس حالات کو جھیلتے جھیلتے زندگی گزر جاتی ہے۔

کہتے ہیں وہاں لڑکیاں بالیاں شاذ و نادر ہی سنگھار کیا کرتی ہیں کہ سراہنے والوں کی ایک بڑی تعداد زیرِ زمین جو سو گئی۔ کسی مرے ہوئے لمحے میں کوئی مردہ ضمیر جانے کیوں مرغزاروں کو مرگ زاروں میں بدلنے کی اجرت مقرر کر گیا۔ اب جو ہیں ان کی گنتی بھی کم

ہوتی جارہی ہے۔ کچھ گمراہی کے اندھیروں میں بھٹک کر یا تو اپاہج اور ناکارہ ہوگئے یا اندھیری کوٹھریوں کی زینت بن گئے۔ آدھے برفانی گھاٹیوں میں زندہ دفن ہوگئے۔ جو باقی بچے وہ یا تو کٹھ پتلی کا رقص سیکھ رہے ہیں یا ناموس و آبرو سے کھیلنے کی مشق کر رہے ہیں۔ یہ تذکرہ درد انگیز بھی ہے اور کربناک بھی۔ لیکن ساتھ ہی پر اسرار بھی۔ ایک عجیب مخمصہ ہے جس میں محصور اور محافظ دونوں ایک دوسرے سے نبرد آزما رہے ہیں کبھی اس کو خطاوار ٹھہرایا جاتا ہے تو کبھی اس کو۔ دونوں ایک دوسرے کے خلاف بداعتمادی میں مبتلا ہیں یا پھر اس کے ساتھ ساتھ یہ طبقاتی جنگ ہے۔ سماج کی مختلف سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے۔ خود گرتے ہوئے یا دوسروں کو گراتے ہوئے کس سمت جارہے ہیں وہ یقیناً خود بھی نہیں جانتے ہوں گے۔ اور وہ جو اس سب میں شامل نہیں ہیں وہ بھی اس آفت خیزی کے ہچکولوں سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتے۔ شاید وہ ہی سب سے زیادہ متاثر بھی ہیں آپ کے پیڑ پودوں کا پشتینی نوجوان مالی مہینوں غائب رہنے کے بعد اچانک نمودار ہو اور اس کا حلیہ، شکل، طرزِ گفتگو ہر چیز بدل چکی ہو اور وہ مختلف حشر سامانیوں سے لیس آپ ہی پر حکم چلائے، تو آپ کے پاس سوائے ایک محکوم کی طرح سر جھکائے کھڑے رہنے اور اس کا حکم بجالانے کے اور کون سا راستہ رہ جاتا ہے یا پھر آپ کے علاقے کے متوقع سکون کو فنا کرتا ہوا وزنی جوتوں کا ہیبت ناک شور آپ کی سماعت پر عتاب بن کر ٹوٹے تو آپ کی بے بسی آپ پر ہنسے گی نہیں تو اور کیا کرے گی کہ آپ کی آنکھوں نے دردر اجل کو محوِ رقص دیکھا ہے۔ جب خوف اپنا پیلا چہرہ لٹکائے گھوم رہا تھا۔ موت دانت نکوسے ہنستی رہی، چنار آگ برساتے رہے، جھیلیں لاوا اگلتی رہیں، پہاڑ قبرستان بن گئے۔ خوش رنگ پھول مرجھا گئے خوش گلو طیور ہجرت کر گئے۔ مجبور اور ناداروں کا جینا مرنا ایک سا ہوگیا۔ کہیں جائے اماں نہیں رہی۔ زندگی لہو لہان ہوگئی۔ کچھ دل کے مریض ہوگئے کچھ ذہنی توازن کھو بیٹھے۔ کہتے ہیں لوگوں کو سرخ رنگ سے نفرت ہوگئی۔ اگر کہیں کوئی شادی ہوتی ہے تو دلہنیں تک سرخ جوڑا نہیں پہنتیں۔ میں بھی کبھی سفید قمیص شلوار پر سرخ دوپٹہ بڑے چاؤ سے اوڑھا کرتی تھی۔ لیکن اب اس اتصال کے تصور سے ہی

لرز جاتی ہوں ۔ میری نظروں نے سڑکوں پر اور گلیوں میں سرخ رنگ بہتے دیکھا ہے
مجھے ہر رنگ سے نفرت ہوگئی ہے ۔ یہ میری اپنی سوچ ہے ۔ ضروری نہیں کہ اس طرح سب ہی
محسوس کریں ـــــ میرے دو کڑیل جوان بھائی اچھا خاصا گھر آتے آتے مخالف سمتوں سے
اٹھنے والے ابدی طوفانوں کے درمیان ایسے پھنسے کہ سرخ رنگ بن کر بہہ گئے ۔ لوٹائے گئے
تو سفید رنگ اوڑھا کر مگر پھر بھی سفیدی کے نیچے سے سرخی جھانک جھانک کر اپنی مظلومیت کی
داستان سنا رہی تھی‘ اس طرح کے مناظر پتلیوں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے رشتہ جوڑ لیتے ہیں کہ ذہن
بھولنا بھی چاہے تو آنکھیں ان کا عکس سامنے لے آتی ہیں ۔ لیکن اس قیامتِ کبریٰ میں
کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اپنی ڈگر پر چل رہے تھے‘ اپنے گرد و پیش سے بے خبر زندگی کے
مزے لوٹ رہے تھے ۔ جو خواہشوں کی خاطر کوئی بھی سمجھوتہ کر سکتے تھے ۔ شاید انھیں جینے کا
فن آتا تھا ـــ وہ زندگی کو بھرپور جیتے تھے ۔ چاہے وہاں رہ کر یا وہاں سے نکل کر ۔ زندگی
ان کے لیے ایک نشیلے تجربے سے کچھ کم تھی نہ زیادہ ۔

وہ خاتون مجھے برابر دیکھے جا رہی تھی ۔ اس کے ساتھ کھڑا مرد بھی ۔ شاید انھوں نے
مجھے پہلے کبھی دیکھا ہو اور اب حالات اور وقت کے بدلاؤ میں ، میں اتنا بدل گئی ہوں کہ وہ
مجھے پہچان نہ پا رہے ہوں ۔ اور پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان
کا کوئی رشتہ دار ہمارا پڑوسی رہا ہو اور وہ اس کی سب کی خیریت دریافت کرنا
چاہ رہے ہوں ۔ یا وہ خاتون کبھی میرے ساتھ پڑھتی رہی ہو ۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے
کسی ملنے والے کے جاننے والے ہوں اور میرے بھائیوں کے بارے میں سن کر افسوس
ظاہر کرنا چاہ رہے ہوں اور اس کے لیے انھیں مجھے پہچاننا ضروری ہو اور اسی لیے اس
قدر غور سے دیکھ رہے ہوں وہ میرا چہرہ ۔ یا شاید ان کا بھی کوئی عزیز ایسے کسی سانحے کا شکار
ہوا ہو اور وہ مجھ سے دکھ بانٹنا چاہتے ہوں ۔

کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں جنھیں ہم اکثر دیکھتے ہیں پہچانتے ہیں مگر جانتے نہیں ،
اور چونکہ ان سے کوئی رابطہ نہیں ہوا ہوتا اس لیے وہ وقت کے ساتھ ساتھ ذہن سے
اتر جاتے ہیں کہ ان کی پہچان نظروں تک ہی محدود ہوتی ہے اور جب نظر آنا بند ہو جاتے

ہیں تو ذہن میں یادوں کے محفوظ خانوں میں داخل نہیں ہو پاتے۔ بسیار کوشش کے باوجود مجھے کسی بھی طرح ان سے منسلک ماضی کا کوئی لمحہ یاد نہیں آرہا۔ مگر اتنے لوگوں میں سے ان کا صرف مجھے دیکھنا بار بار سوچ میں مبتلا کر رہا تھا مجھے بارہا ایسا بھی محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہوں کہ کہنے سننے سے درد کی شدّت وقتی طور پر کم ہو جاتی ہے۔

ان کے پاس ایک سفری بیگ اور ایک اٹیچی کیس تھا۔ کہیں سے آرہے تھے وہ اور غالباً کسی کے منتظر تھے۔

پھر کچھ وقت اور گزرنے پر آپس میں کچھ اور باتیں کرنے کے بعد وہ میری طرف آئے۔ مرد مسکرا رہا تھا اور عورت کا چہرہ بغیر کسی تاثر کے تھا۔ میرے بالکل قریب پہنچ کر وہ ذرا رک کر بولی "آپ سے کچھ پوچھنا تھا۔" لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔

"ضرور۔ پوچھیے۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"آپ برا تو نہیں مانیں گی؟ اصل میں آپ ہم کو نہیں جانتیں۔ مگر ——" وہ کچھ دیر خاموش ہو کر پھر بولی:

"ہم بھی آپ کو نہیں جانتے ..... ہم کچھ مہینے پہلے ہی سعودی عرب سے آئے ہیں۔ اب یہیں رہتے ہیں۔ دراصل ان دنوں ہم نے یہاں وہاں کئی شادیاں اور کچھ غم کی محفلیں اٹینڈ کی ہیں۔ آج بھی ہم اسی جہاز سے پرسہ دے کر لوٹے ہیں۔" اس نے آمد و رفت سے مطلع کرنے والے بورڈ کی طرف دیکھ کر اسی جہاز کے نمبر کی طرف اشارہ کر کے کہا جس سے والد صاحب جانے والے تھے۔

"کافی دیر باہر رہنے کے بعد اب ہر احباب و اقارب سے ملنا پڑتا ہے۔ اس غمگین مجلس میں بہت سی لیڈیز آئی تھیں بہت اچھا CROWD تھا وہاں۔ میری کئی خواتین سے خوب باتیں بھی ہوئیں۔" وہ خواہ مخواہ ہنسنے لگی پھر بولی "میں نے آج تک ایسے جھمکے کہیں نہیں دیکھے۔ آپ نے یہ کہاں سے لیے ہیں۔ سعودیہ میں تو کئی کنٹریز کے لوگ رہتے ہیں ... وہاں بھی اتنے خوبصورت جھمکے میری نظر سے کبھی نہیں گزرے۔" اس نے برسوں سے میرے کانوں میں پڑی چھوٹی چھوٹی بالیوں کو دیکھ کر کہا۔ جانے کس زمانے سے تھیں یہ بالیاں میرے کانوں میں جن

کے ساتھ ایک ننھی ننھی زنجیر کے سہارے ایک چھوٹا سا موتی لٹک رہا تھا۔

اس کی بات سمجھنے میں جیسے کچھ دیر لگی مجھے، میں بے خیالی میں اپنے کانوں میں پڑی بالیوں کو چھو کر رہ گئی۔ ماتھے پر سوالیہ سا نشان ڈالے نیم حیران نظروں سے ان دونوں کی طرف باری باری دیکھنے لگی۔ یقیناً وہ اس کے بعد کچھ بات کرنے والے ہوں گے۔ اور میں اس اصل بات کی منتظر تھی۔ جس کی وجہ سے میں گھنٹہ بھر سے ان کی نظروں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ اور جس کے بارے میں، میں مختلف قیاس آرائیاں کر رہی تھی۔ جانے کیا کیا سوچ رہی تھی۔ اداس ہو رہی تھی، غمگین ہو رہی تھی۔ پرانے زخم کرید رہی تھی، نئے حادثوں کے خوف سے کبھی لرزاں تھی تو کبھی پریشان۔

"جی۔ بس ایسے ہی پتہ نہیں کب سے یہ بالیاں..." میں کچھ سوچتی ہوئی رک رک کر بولتی ہوئی ان کی طرف دیکھ رہی تھی — مرد باچھیں کھولے سراپا سوال بنا ہوا تھا اور عورت میرا کندھا نہایت بے تکلفانہ انداز میں دباتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ "بتایئے نا، کیا سوچ رہی ہیں۔ سچ بتایئے کہاں سے لیے ہیں یہ جھمکے آپ نے؟"

گُلچیں

فیروزہ نے جب بازو میرے سامنے کر دیا تو میں واقعی حیران رہ گئی۔ اس کی کلائی سے کچھ اوپر دائرے کی شکل میں ننھے ننھے دانتوں کے چھوٹے چھوٹے گہرے سرخ نشان تھے۔

" کیا یہ سب اس نے کیا؟ " میں نے پوچھا۔

" ہاں — دن بہ دن وہ تو جنگلی ہوتا جا رہا ہے۔" وہ حقارت سے بولی۔

" پھر تم نے کیا کیا؟ "

" میں کیا کرتی۔ غصّے اور درد سے چلاّ رہی تھی۔ خوب پیٹا میں نے اسے۔ اتنا کہ گھنٹہ بھر ہچکیاں لے لے کر روتا رہا۔ روتے روتے سو گیا۔ نیند میں ہچکیاں لے رہا ہے۔" وہ بولی۔

واقعی بہت مارا ہوگا اس نے ننھی سی جان کو۔ ——— بھلا ایسا کون سا پہلوان تھا وہ چند منّے سے دانتوں والا۔

کوئی ڈھائی تین سال پہلے میں نے اسے دیکھا تھا۔ تب وہ بے حد کمزور اور نازک سا تھا۔ سرما کی ایک خوشگوار دوپہر تھی۔ جب میں فیروزہ کے ہاں گئی تھی۔ گیٹ نیم وا تھا۔ گھر کے اندر داخل ہوئی تو کوئی نظر نہ آیا۔ سفیدے کے لمبے لمبے پیڑوں میں گھرا ہوا یہ گھر اندر سے قدرے تاریک تھا اور میں چونکہ دھوپ میں سے ہو کر اندر آئی تھی اس لیے مجھے ٹھیک سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک کمرے سے ہوتی ہوئی میں سب کمروں میں غور سے دیکھتی ہوئی آخری کمرے تک گئی۔ اندر کوئی نہیں تھا۔ مگر چھت پر سے آہٹ سنائی دی۔ اچھا تو

سب لوگ اوپر دھوپ سینک رہے ہیں۔ جب واپس پلٹی تو اتنی دیر میں نظریں تاریکی سے کچھ کچھ مانوس ہو چکی تھیں۔ بیچ والے کمرے میں مجھے اندھیرے میں دو چمکتی ہوئی آنکھیں نظر آئیں۔ غور سے دیکھا تو بید کی ٹہنیوں سے بنے ایک پرانے سے پالنے میں ایک ننھا سا بچہ لیٹا ہوا تھا۔ ۴، ۶ ماہ کا۔ چپ چاپ۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں ہلاتا ہوا مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے پاس ہی دودھ کی آدھی خالی بوتل پڑی اس کا گریبان بھگو رہی تھی۔ میں پالنے کے پاس گئی تو وہ مسکرانے لگا۔ میں نے اسے گود میں اٹھالیا۔ وہ میرے شانے سے لگ گیا۔ اس کا لنگوٹ بہت بھیگا ہوا تھا جانے کتنی دفعہ اس نے سردی لگ جانے کی وجہ سے پیشاب کر دیا تھا۔ پھر بھی وہ صابر و شاکر چپ چاپ لیٹا تھا۔ اسے گود میں اٹھائے میں چھت پر آگئی۔ روشنی میں دیکھا تو دھان پان سا ایک کمزور بچہ تھا وہ۔ سر کے گھنگھریالے سنہرے بال الجھے ہوئے تھے۔ رنگ صاف تھا۔

اوپر سب لوگ دھوپ کا مزا لے رہے تھے۔ کوئی اسے میری گود میں دیکھ کر اس کی طرف نہیں بڑھا نہ ہی کسی نے اس کے گیلے کپڑوں کی پروا کی۔ سب میرا حال احوال پوچھنے لگے۔

اس کا نام کسی نے نہیں رکھا تھا۔ اس کا بڑا بھائی منّا اس سے سال بھر بڑا تھا۔ منّا اسے بابا بلاتا تھا۔ بابا فیروزہ۔ کے بھائی ندا کا بیٹا تھا۔ یہ اس کا دوسرا بچہ تھا۔ جب کہ خود اس کی عمر کافی کم تھی، وہ کالج ہی میں تھا کہ اس نے اپنی کلاس کی ایک نازک سی لڑکی نازلی سے شادی کر لی یا گھر والوں کو منا کر کروالی۔ نازلی کا نام تھا بے معنی مگر بولنے اور سننے میں اچھا لگتا تھا جیسے نازک سی نازلی۔ نازنین سی نازلی۔

کچھ سال تو دونوں نے فیل اور پاس ہوتے ہوئے گزار دیے۔ جب پہلا بچہ ہوا تو فیروزہ کے ہاں جیسے بہار آگئی۔ فیروزہ گھر میں سب سے بڑی تھی CHILD PSYCHOLOGY میں اس نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی تھی۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ عمر کچھ زیادہ ہو گئی تھی تعلیم حاصل کرتے کرتے۔ اچھی نوکری مل گئی۔ اور پھر ماں تھی، چھوٹا بھائی تھا۔ زندگی آرام سے کٹ رہی تھی۔ ایک فطری کمی تھی وہ منّا نے پوری کر دی۔ وہ اس پر اپنی ساری ممتا نچھاور کرتی۔ اس کا ہر طرح سے خیال رکھتی۔ گھر میں سب کی آنکھ کا تارہ تھا وہ۔ نازلی اور ندا نے اب سنجیدگی

سے آگے پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ بے فکر ہو کر پروفیشنل کالج جانے لگے کہ منّا کی ساری ذمہ داری فیروزہ نے لے لی تھی۔ اور وہ شہزادوں کی طرح پل رہا تھا۔ لیکن کچھ دنوں بعد پتہ چلا کہ دلہن بی بھر امید سے ہیں۔ گھر میں کوئی اس بات کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ کوشش کی گئی کہ بچہ ضائع کیا جائے۔ مگر دیر ہو چکی تھی۔ نازلی کی جان کو خطرہ ہو سکتا تھا۔ گھر میں تناؤ سا پیدا ہو گیا۔ سب نازلی سے نالاں تھے بضد تھے کہ ABORTION کرا لیا جائے۔

منّا تو آرام سے پل ہی رہا تھا۔ یہ ان دونوں کا اپنا خیال تھا۔

اب نازلی کو وہ منہ پر تو کہنے سے رہے کہ بے شک مرجایئے مگر بچہ پیدا نہ کیجیے۔ نتیجتاً وہ اس سے بے حد خفا رہا کرتے اس کا کالج جانا بھی ناگوار گزرنے لگا۔ اس کی ہر بات بری لگتی۔ نت نئے طریقوں سے اسے دق کیا جاتا اس کے شوہر کو ہر طرح سے بدظن کیے جانے کی کوشش جاری رہتی۔ گھر میں وہ اکیلی ہو گئی تھی۔ ادھر طبیعت اور مضمحل رہنے لگی تھی اس سے اپنا آپ سنبھلتا نہ تھا۔ ایسے میں جب اسے محبت، اور ہمدردی چاہیے تھی، دلجوئی چاہیے تھی، کوئی اس سے سیدھے منہ بات تک نہ کرتا۔ جانے ندا کو بھی کیا ہو گیا تھا۔ ایسے میں تو شوہر بیوی کا ہر ناز اٹھاتے ہیں۔ اس کی اسکالر نند اس کی کسی بات کا جواب نہ دیتیں۔ منّا کو اس کے پاس نہ پھٹکنے دیتیں۔ وہ ان کے بیجا CONCERN سے اس قدر بگڑ گیا تھا کہ ماں کو منہ چڑاتا۔ اس سے نہایت بدتمیزی سے بولتا۔ پھوپھی کو ہی ماں سمجھتا۔

نازلی کی زندگی اجیرن ہو چکی تھی۔ ساس تو شاید کبھی اس سے ہنس بول بھی لیتیں، مگر گھر میں بیٹھی کنواری نند نے زندگی جہنم زار بنا دی تھی۔

ایک روز جب سب کی دھتکار سہہ کر رات بھر روتی رہی تو جیسے اس کا جی بھر گیا۔

تب کسی سے بغیر کچھ کہے صبح ہوتے ہی وہ ماں کے گھر چلی گئی یہ مائیکے کی چوکھٹ جو پرائی ہو جانے کے بعد بھی اپنی لگتی ہے اور جس کی یاد عمر کی آخری حدوں تک پہنچ کر بھی تازہ رہتی ہے۔ پریشانی سے ایک ہی تو فرار ہے یہ بچپن کی یادیں' بابل کا آنگن۔

بابا وہیں پیدا ہوا۔ کب سے سسرال والوں نے اس کی سدھ نہ لی تھی۔ بابا کی پیدائش کا سن کر بھی کوئی نہیں آیا۔ ندا میں اتنی ہمت تو تھی نہیں کہ ماں اور بڑی بہن کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کر پاتا۔ اندر سے وہ اس ناانصافی کو محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کو احساسِ

جرم بھی تھا۔ اس لگاتار خاموشی نے اس کے اندر بغاوت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا اور احتجاجاً وہ نازلی کو لینے چلا گیا۔ اسے اپنے نوزائیدہ بچّے کو بھی تو دیکھنا تھا۔ وہ انھیں لے تو آیا۔ مگر نہ تو نازلی کے تئیں اس کے گھر والوں کے رویّے میں کوئی تبدیلی آئی اور نہ ہی بابا کو مُنا جیسا پیار ملا۔ بلکہ ماں باپ کے علاوہ اور کسی نے اسے پیار دیا ہی نہیں۔ ہر نظر میں نازلی کے لیے نفرت تھی، اس تناؤ بھرے ماحول سے نازلی بے حال ہو گئی تھی۔ اور سب کے آگے اس کا شوہر تقریباً بے بس۔

نازلی کی والدہ بیمار ہوئیں تو وہ انھیں دیکھنے چلی گئی۔ شام کو اس کا شوہر اسے ساتھ لے کر گھر آیا... تو گھر میں گھسنے نہ دیا گیا۔ کہا گیا کہ اکیلے آؤ۔ اسے لے کر تم اس گھر میں نہیں آ سکتے۔ نہ ہی بابا کو انھیں دیا گیا کہ اس طرح ندا کے لوٹنے کی بہت کم امید رہ جاتی۔ نہ ندا میں اتنی ہمت تھی کہ ان سے اپنا حق مانگتا۔ اپنی بیوی کے لیے انصاف مانگتا۔ ناچار بیوی کو لے کر واپس چلا آگیا۔ نازلی رات بھر بابا کو یاد کر کے تڑپتی رہی۔ بابا نہ آیا۔ نہ ہی ندا نازلی کو چھوڑ کر گھر گیا۔

اور ایسے ہی وقت گزرتا گیا۔ بابا گھر میں ایک ان چاہی شے کی طرح پلنے لگا۔ اس کے ماں باپ نے پلٹ کر وہاں کا رُخ نہ کیا۔ گو کہ دل غم سے چھلنی تھے۔ مگر حالات کے سامنے بے بس۔ سب اپنی اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے۔ یہ تھے کہ نچاہتے ہوئے بھی اولاد سے دور تھے۔ اور وہ تھے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اپنے پاس رکھے ہوئے تھے۔ وہ بیمار ہو جاتا تو ہفتوں بیماری جھیلنے کے بعد کسی کو اس کے لیے دوا لانے کا خیال آتا۔ اسے کوئی پابندی سے نہلاتا بھی نہ تھا۔ اس کے ننھے سے دماغ نے صبر کرنا سیکھ لیا۔ مگر جوں جوں اس کی عمر بڑھتی گئی وہ اپنے ساتھ ہونے والے اس فرق کو محسوس کرنے لگا۔ سال بھر کا کمزور و ناتواں سا بچّہ سب کی دھتکار کا شکار۔ اس کے سامنے دودھ کی بوتل ایسے پھینکی جاتی — جیسے گلی کے کتّے کے سامنے روٹی کا ٹکڑا۔ اِدھر اس کے بے انتہا شریف بلکہ بزدل ماں باپ کچھ دیر اور خدا کے انصاف کا انتظار کرنا چاہتے تھے — اُدھر اس کا بھائی سب کی آنکھ کا تارا تھا۔ اور خود وہ ایک غیر کی طرح۔ اب وہ دو سال کا ہو گیا تھا۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ بھائی سے سب پیار کرتے ہیں۔ اور اس سے نہیں تو وہ اداس ہو جاتا... اور کبھی کبھی تو اسے سمجھ میں

نہیں آتا کہ وہ کیوں دکھی ہے، رو رہا ہے۔ بس، کوئی بات چھوٹے سے دل کو چوٹ لگا کر ہو چکتی۔
... اور وہ کھویا کھویا سا سب کو پُر امید نظروں سے تاکا کرتا۔ جہاں منّا کی جن باتوں پر جن حرکتوں
پر سب لوگ ہنس ہنس کر اسے پیار کرتے ، وہیں وہ کسی حرکت کی نقل کرتا کہ اسے بھی
شاید اسی طرح پیار کیا جائے گا تو اسے حقارت سے ڈانٹ دیا جاتا۔ تب وہ بجھ سا جاتا۔
حیران اور پریشان ہو جاتا، روٹھ سا جاتا۔ کس سے؟ یہ اس کی سمجھ میں نہ آتا۔ بس اس کی
بھوک تک روٹھ جاتی۔ کمزور سا، بے بس سا، ہڈیوں کا ڈھانچہ سا، پھر جانے کیا ہوا کہ اسے
دکھ کم ہوتا اور غصّہ زیادہ آتا ۔۔۔ آہستہ آہستہ جب اس نے محسوس کرنا شروع کیا کہ کوئی اس
کی طرف توجہ ہی نہیں دیتا تو چھوٹی سی بات پر اسے بہت زیادہ غصّہ آنے لگتا۔ غصّہ آتا تو
زور زور سے چیختا اور مار کھاتا۔ سب سے پٹتا۔ جوں جوں وہ بڑا ہوتا گیا اس میں بغاوت
کا جذبہ اور بڑھتا گیا۔ وہ خود ہی اپنی ضروریات کو پورا کرنے لگا۔ پہلے جو بھی دیا جاتا کھا لیتا۔
اب جو اسے اچھا لگتا وہ کھا جاتا۔ پہلے بھائی کا جھوٹا ملتا تھا۔ اب وہ اپنی پسند سے کھاتا
پیتا۔ چاہے ڈانٹ پڑے یا مار پڑے وہ کسی سے ڈرتا نہیں تھا۔ ان سب چیزوں کی بدولت
اس کی صحت خاصی اچھی ہو گئی۔ اور کچھ ہی مہینوں میں وہ نہایت تندرست ہو گیا۔ اگر اس کی
کوئی خواہش پوری نہ ہوتی تو وہ زور زور سے رونے لگتا کہ پاس پڑوس والے پوچھنے لگتے کہ
بابا کیوں رو رہے ہیں؟ ایسی کچی باتیں برداشت نہ ہوتیں۔ گھر والے کوشش کرتے کہ نہ ہی روئے
اگر کبھی رات کو رونے لگتا تو سب کہتے کہ شور نہ مچاؤ بھیا جاگ جائیں گے تو وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر
روتا۔ ایسا وحشی ہو جاتا کہ کسی کے قابو میں ہی نہ آتا۔ بات بات میں منّا کی اہمیت کو محسوس
کر کر کے غم و غصّہ سے دیوانہ ہو جاتا۔ تب تنگ آ کر اسے بہلانے کی خاطر بادلِ ناخواستہ
کوئی اسے صحن میں ٹہلانے لگتا یا کوئی گود میں اٹھا کر اوپر چھت پر لے جاتا۔ یہ بات
اس نے جان لی تھی اور صرف اسی ہتھیار کے ____________
استعمال سے اسے گھر والوں سے کچھ دیر کے لیے توجہ ملتی تھی۔ اس نے ان کو ان کی لاپروائی
کی سزا دینا سیکھ لیا تھا۔ وہ اس کے شور سے اب گھبرانے لگے تھے۔ انھیں منّا کے بگڑ جانے
کا ڈر تھا۔ آئے دن گھر میں مشورے ہونے لگے کہ اب اس کو کیسے سنبھالا جائے کہ اب اس کی
حرکات ناقابلِ برداشت ہو گئی تھیں۔ غصّہ میں اسے جو کچھ نظر آتا اسے اٹھا کر پٹخ دیتا۔

ایک خیال یہ تھا کہ اسے نازلی کے پاس بھیج دیا جائے۔ بھلے ــــــ ہی ندا نہ آئے۔ مگر اس میں تو ان کی ہار تھی۔ پھر کیا اسے بورڈنگ میں داخل کروا دیا جائے۔ اس سے چھٹکارا تو کسی طرح پانا ہی تھا۔ فیروزہ کہتی تھی "بابا بالکل اپنی ماں پر گیا ہے۔ اسی لیے اس کی کسی سے نہیں بنتی۔ ایک غلطی پر دوسری غلطی کیے جاتا ہے۔ اور سب سے پٹتا ہے۔ اس کی ماں بھی تو کیسے چپ رہا کرتی ہے۔ یہاں تک کہ ہمارے بھائی کو آنچل کے کونے سے باندھ لے اڑی۔ اس نے بھی نازلی کی طرح اب اصلی صورت دکھائی ہے اپنی ورنہ منّا کو دیکھیے کتنا بھولا، پیارا اور معصوم ہے وہ تو حد سے زیادہ شریف ہے۔ بالکل ہم لوگوں کی طرح اور بابا بے انتہا شریر۔ کہیں اب منّا اس کا اثر نہ لے۔ یہ تو اسے بگاڑ کر رکھ دے گا۔"

فیروزہ نے بچّوں کی نفسیات پر تحقیق کی تھی اس نے خود اس معصوم کے ذہن کے شفاف اسکرین پر جو لکھا ہے ... وہی تو پڑھ رہا ہے وہ۔ جو اسے ملا وہی تو انھیں لوٹا رہا ہے۔

فیروزہ کو اور بھی کئی اندیشے تھے۔ وہ کہتی "اب تو بابا بہت صحت مند ہو گیا ہے۔ منّا کی تو جان کا دشمن ہے۔ کتنی دفعہ تو اسے خوب پیٹا ہے۔ کبھی بال نوچ کے گرایا ہے۔ کبھی چہرہ نوچا ہے۔ کہیں کسی دن اس کی کوئی ہڈی ہی نہ توڑ دے۔ اگر اسے نازلی کے پاس بھیج دیا جائے تو کہیں وہ دوسرا بچّہ طلب کرنے کی جرأت نہ کر بیٹھیں اور پھر اس میں تو نازلی کی جیت ہے۔"

.... طے یہ ہوا کہ بابا کو بورڈنگ ہاؤس ہی بھیجا جانا چاہیے۔ مگر اس کے لیے تو پورا سال انتظار کرنا پڑے گا۔ پتہ کیا جانے لگا کہ کوئی ایسا بورڈنگ ہو جو کم سے کم عمر کے بچّوں کو بھی رکھتا ہو۔ "بس وہیں سدھرے گا یہ۔ ساری شرارتیں وہاں کی سخت اور پابند زندگی سے بھول جائے گا۔ اسے پتہ چلے گا کہ جو گھر میں چین سے نہیں بیٹھتا اسے گھر سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔" یہ جملے اُس کے ننھے ننھے کانوں نے بارہا سُنے۔

اس بار اس نے کسی چھوٹی سی بات پر رونا شروع کر دیا۔ فیروزہ نے بتایا۔ رونا بھی ایسا کہ گلا پھاڑ کر چلایا جا رہا ہے اور لاکھ پوچھنے پر بھی وجہ بتا ہی نہیں رہا ہے۔ کیا چاہیے، کچھ نہیں کہتا۔ تمام پسندیدہ چیزوں کی پیش کش ٹھکرا دی۔ فیروزہ نے منانا چاہا تو بازو کاٹ کھایا۔ سب کچھ پھینک دیا۔ گھر کو تماشا بنا دیا۔ پڑوسی پوچھنے چلے آرہے ہیں، کتنی شرمندگی اٹھانا پڑی۔ خوب مار کھائی اور روتے روتے سو گیا۔ نیند میں بھی ہچکیاں بند نہ ہوئیں۔ اب گھنٹوں بعد

جاگاتو ہچکیاں قائم تھیں۔

میں نے دیکھا تو جی خوش ہوگیا۔ دل موہ لینے کی حد تک پیارا بچہ۔ کسی نے کبھی اس کے بال تراشنے پر توجہ نہ دی اور بے توجہی میں بڑھے ہوئے، گھنگھریالے، گھنے، سنہرے بال اس کے گول گول چاند سے مکھڑے کے گرد ہالہ سا بنائے ہوئے تھے۔ بھرے بھرے سے گال، روٹھی روٹھی سی بھولی بھالی آنکھیں، گورے گورے ہاتھ پاؤں، گول مٹول مکھن کی ڈلی ایسی باہنیں اور پنڈلیاں کلائیوں، کہنیوں اور شانوں میں ننھے ننھے گڈھے، بھرا بھرا سینہ۔

اکثر گھر میں ننگ دھڑنگ گھومتا نظر آتا۔ کبھی کوئی ٹی شرٹ پہنی ہوئی ہوتی جس کے تمام بٹن غائب ہوتے۔ اور کالر والے کھلے گریبان میں سے اس کے نرم نرم گلے کے بل دیکھ کر ایسا لگتا جیسے کوئی چھوٹا سا پہلوان ہو یا پھر کبھی کوئی بنیان پہنی ہے تو کبھی بڑے بھائی کا لمبا سا بش شرٹ۔ آج بھی ایک بنیان پہنے ہوئے تھا۔ اتنی مٹی سی پیاری سی شخصیت کہ کلیجے میں بھر لینے کو جی چاہتا تھا۔ مگر یہاں تو اس کی اہمیت ویرانے میں کھلے گل لالہ کی سی تھی۔

رونے اور مار کھانے سے اس کے پھول ایسے گال سوج گئے تھے اور آنکھیں لال بھبوکا ہو رہی تھیں۔ ناراضگی کے تاثرات بدستور قائم تھے۔ جاگا تو نہ کسی سے بات کی نہ کسی کی طرف دیکھا۔ بس اپنے چھوٹے سے بستر پر یوں بیٹھا رہا جیسے کوئی نک چڑھا بادشاہ شاہی تخت پر۔

مجھے دیکھ دیکھ کر پیار آ رہا تھا۔ خوشی بھی ہو رہی تھی کہ ننھی سی جان نے ان ظالموں کو پریشان کر کے کچھ اپنی معصومیت پر ظلم ہونے کا بدلہ تو لے لیا۔ مگر اس کی ذہنی حالت پر رنج بھی ہو رہا تھا۔ مجھ سے فیروزہ کو باتیں کرتے سنا تو نظر اٹھا کر دیکھا۔ مجھ سے نظر ملی تو میں نے باہنیں پھیلا دیں۔ کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا پھر —— راجہ سنگھاسن سے اٹھا اور بھاری بھاری قدم اٹھاتا ہوا میری طرف آنے لگا۔ پھر آدھے راستے سے واپس بھاگا —— چھوٹے چھوٹے پیروں سے سیمنٹ کے فرش پر تھپ تھپ آواز کرتا ہوا، گول گول کولہے، تھل تھل مٹکاتا ہوا دوبارہ اپنے بستر پر دھپ سے جا بیٹھا اور وہاں سے مجھے گردن جھکا کر اور ابرو اٹھا کر دیکھتا رہا۔ میں نے مسکرا کر سر کی جنبش سے بلایا تو اٹھ کر خراماں خراماں چلتا ہوا میری گود میں آ بیٹھا۔ میں نے اسے گود میں اٹھائے اٹھائے فریج میں سے آئس کریم کا بڑا سا سلیب جو میں اپنے ساتھ لائی تھی نکالا۔ اس نے آئس کریم کو دیکھا پھر مجھے۔ کچھ

سیکنڈ میری طرف دیکھا پھر آنکھوں میں مچلتے ہوئے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے سر جھکا لیا۔ میں نے اس کا سر چھاتی سے لگایا ہی تھا کہ وہ زور زور سے ہچکیاں لے کر رونے لگا اور روتے روتے بولا۔ "بابا ناجلی پاچھ جائے گا، ندا پاچھ جائے گا۔ بابا اتھا ہے۔ بابا گندا نہیں ہے، بابا بورڈنگ نہیں جائے گا۔ بابا ناجلی پاچھ جائے گا۔" یہ سن کر سب کے سب حیران رہ گئے۔ فیروزہ غصّہ سے کانپتی ہوئی آگے بڑھی۔" ارے تم — تم کیسے جانتے ہو نازلی کو۔ کون ہے وہ — تم نے دیکھا ہے اسے کیا۔ بولو — بولو —"

اس سے پہلے کہ وہ اسے زناٹے دار تھپڑ مارتی وہ پھر رک رک کر بولا۔" ناجلی میری ممّا ہے۔ ممّا آپ کا بیتا ہے۔ بابا ناجلی کا بیتا ہے۔" پتّھر کے نام والی پتّھر جیسی فیروزہ لاجواب ہوگئی۔

" اچھّا تو تمھیں سب یاد ہے —" وہ بولی۔" تم تو چند ماہ کے تھے۔ بالکل — بالکل ماں جیسے نکلے۔ میں نے کہا تھا نا کہ یہ بہت چالاک ہے۔ اس کے ساتھ کوئی بھی تعلق رکھنا ہمارے لیے اچھا نہیں ہوگا —

یہ بورڈنگ سے بھی آیا کرے گا۔ یہ تو میرے منّا کو بگاڑ کر رکھ دے گا۔ اس کا اس سے بالکل میل نہ ہونا چاہیے۔ کل ہی اسے اس کی ماں کے پاس بھیج دوں گی — ہاں کل ہی۔" وہ کانپتی ہوئی مگر فیصلہ کن انداز میں بولتی گئی — اور دو معصوم آنسو بھرے نین مسکرا اٹھے اور ننھی ننھی انگلیاں آئس کریم کا ریپر کھولنے لگیں۔

بُلبُل

بھاری سی جین کی پینٹ کو کھنگال کر نچوڑنے کے بعد جب میں اسے ہینگر پر پھیلانے کے لیے سیدھی کھڑی ہونے لگی تو پورے بدن سے ٹیس سی اٹھی۔ پوری طرح ایستادہ ہونے میں مجھے دس بارہ سیکنڈ تو ضرور لگے۔ اور جب میں نے جین کو زور سے جھٹک کر جھاڑا تو میرے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی کا وہ لمبا سا ناخن جو جین کی موری کو رگڑتے ہوئے آدھا ٹوٹا تھا، انگلی کے پور کی تھوڑی سی جلد چھیلتا ہوا پورا الگ ہو گیا۔ خون کے قطرے گرنے لگے اور میں درد سے بلبلا اٹھی۔ مگر اس خیال سے کہ کہیں جین پر خون کا دھبہ نہ لگ جائے میں نے ایک ہاتھ سے بمشکل تمام اسے ہینگر پر ڈال دیا۔ انگلی پر ٹشو پیپر لپیٹ کر میں کھڑکی کی طرف لپکی میں نے کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے۔ اندھیروں سے نکل کر آتا ہوا، ہوا کا ایک اداس جھونکا — میرے چہرے سے ٹکرایا۔ جانے اتنی جلدی اندھیرا کیسے ہو گیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو میں نے کچھ دیر بعد ڈوبنے والے سورج کی ہلکی سی جھلک دیکھی تھی۔ بس اتنی سی دیر میں؟ — ایک ہی تو پینٹ دھوئی تھی میں نے — میری انگلی کا درد میرے دل میں اتر آیا۔ ایک تھکی ہوئی نظر میں نے آسمان کی طرف اٹھائی۔ اتنے وسیع آسمان پر مشتری اکیلا چمک رہا تھا۔ مشتری کا عکس میری آنکھوں میں دھندلا سا گیا — اس ذرا سی بات پر — یہ آنسو بھی —

کچھ دن پہلے جب انھوں نے بتایا کہ ان کے دفتری کام کے سلسلے میں ہم لوگ تین دن کے لیے شملہ جا رہے ہیں تو مسرّت کی ایک لہر میرے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ دراصل میری اپنی

چھٹی کے بھی یہ ہی تین دن تھے۔ ان دنوں منّو کی بھی چھٹیاں چل رہی تھیں۔ معلوم نہیں میرا وقت کہاں چلا جاتا ہے۔ لوگ بور کیسے ہوتے ہوں گے۔ مجھے تو بور ہونے کا وقت کبھی میسر نہیں آیا۔ ویسے کچھ کرنا تو ہوتا نہیں مجھے ایسا۔ مگر پھر بھی کبھی کبھی میں ایک ایک لمحے کو اپنے پاس بلا کر رہ جاتی ہوں۔ اسے دل کی گہرائیوں سے یاد کرتی ہوں۔ پچکارتی ہوں۔ تصورات کی باہیں پسارے اس سے وعدہ کرتی ہوں کہ اسے اتنے خوبصورت انداز سے گزاروں گی کہ شاید ہی اسے کسی نے اتنا حسن بخشا ہو۔ اس کی منت اور خوشامد کرتی ہوں۔ بڑی مشکل سے اتنی ساری عاجزی کے بعد جب وہ ایک لمحہ میرے پاس آنے کو تیار ہوتا ہے تو — اسی وقت کُکر کی سیٹی، ٹیلیفون کی آواز، دروازے کی گھنٹی، بچّوں کی پکار، گوالے کی ڈولچی کی کھڑکھڑاہٹ یا پھر کسی کام کا احساسِ ذمہ داری — اور میرا اتنے جتن سے بلایا ہوا لمحہ مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی کہیں دور ساکت ہو جاتا ہے اور میں خالی دامن اور خالی باہیں لیے کوئی فرض پورا کرنے کے لیے آگے بڑھ جاتی ہوں۔ اور پھر مجھے دن بھر کرنا ہی کیا ہوتا ہے۔ وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ کام والی کپڑے دھوتی ہے صفائی کرتی ہے۔ اب ایسا کون سا کام رہ جاتا ہے۔ ذرا سا بچّوں کو ہی تو دیکھنا ہوتا ہے۔ ان کی بکھری ہوئی چیزیں اپنی جگہ پر رکھنا۔ وہ اودھم بھی تو بہت مچاتے ہیں۔ یا پھر کھانا بنانا۔ سودا سُلف لے آنا یا دیگر خریداری وغیرہ کرنا۔ چھوٹے موٹے گھریلو کاموں کے لیے بجلی والا یا نل ول ٹھیک کرنے والا بلانا۔ مجھے کہیں جانا تو ہوتا نہیں۔ آرام سے گھر میں کام کرتی، اپنے سامنے سب ٹھیک ٹھاک کرواتی رہوں گی تو میرا وقت گزرتا جائے گا۔ مستعد رہوں گی تو تندرست رہوں گی۔ وہ نوکر کے سخت خلاف ہیں۔ کہتے ہیں بڑے شہروں میں چھوٹا نوکر رکھنا بھی خطرہ مول لینے کے برابر ہے۔ وہ بہت عقلمند ہیں۔ انھیں ہر بات کا تجربہ ہے۔ اب بھلا میں گھریلو عورت یہ سب کیا جانوں۔ مجھے کرنا ہی کیا ہوتا ہے ایسا۔ جھاڑ پونچھ لیا کپڑے سنبھال لیے۔ منی کا دودھ، NAPIES وغیرہ منے کی کتابیں کھلونے وغیرہ۔ اس کا ہوم ورک بس اور کیا۔ پتہ نہیں چیزیں بار بار کیوں بکھر جاتی ہیں اور انھیں ٹھیک کرنے میں اتنا وقت کیوں لگتا ہے۔ اور پھر یہ وقت کیسے اتنی جلدی گزر جاتا۔

وہ بہت مصروف رہتے ہیں۔

اور میں سارا دن گھر میں ہی گزارتی ہوں۔ پھر بھی یہ تین دن جو اس گرمی سے دور ایک خوبصورت مقام پر گزریں گے، میرے اپنے ہوں گے۔ اور بچّے نئی جگہ میں محو رہیں گے۔ نہ باورچی خانہ، نہ خریداری۔ صرف خوبصورت پہاڑ، رنگ برنگے پرندے اور میٹھی میٹھی ان کی بولیاں، بڑے بڑے دانتوں والے بندر اور کالے منہ اور لمبی دم والے لنگور۔ ہری ہری گھاس اور خوش رنگ پھولوں پر منڈلاتی نیلی پیلی تتلیاں۔ چاندنی رات اور ناآلودہ آسمان کے بے شمار تارے۔ طلوع اور غروبِ آفتاب کا شفق گوں آسمان۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں اور بھیگی بھیگی راتیں۔ پل پل آنکھ مچولی کرتی ہوئی دھوپ کی کرنیں۔ اور نہ جانے کیا کیا۔ یہ سب میں اپنی مرضی سے دیکھوں گی۔ محسوس کروں گی۔ یہ ۷۲ گھنٹے میرے اپنے ہوں گے۔ اوہ ۔۔ کتنا سکون ملتا ہے اس تصوّر سے مجھے۔ اسے محسوس کروں گی تو کیسا لگے گا۔ میرے من میں گدگدی سی ہونے لگتی ہے۔ زندگی سہل سی معلوم ہونے لگتی ہے۔ میں ہفتہ بھر پہلے ہی سفر کی تیاریوں میں لگ گئی اس جھلستی گرمی سے تین دن دور۔ بہت ہوتے ہیں تین دن۔ یہ تین دن مجھے پوری طرح سے RECREATE کریں گے۔

سفر پر جانے کی شام میں نے سب کی پیکنگ کی۔ رات کے دو بج گئے یہ سب کرنے میں۔ صبح ہمیں ہمالین کوئین پکڑنی تھی چھ بجے سے پہلے۔ اس کے لیے ہمیں گھر سے ۵ بجے چلنا ہوگا۔ اور پھر مجھے چار بجے اٹھنا ہوگا۔ یہ بستر میں چائے پینے کے عادی ہیں۔ ان سب کے تیار ہونے سے جو چیزیں بکھریں گی انھیں سمیٹنا ہوگا۔ مسہریاں بھی ٹھیک کرنی ہوں گی۔ کام والی تو اس وقت ہوگی نہیں۔ سب صفائی وغیرہ کر کے ہی نکلنا ہوگا۔

باہر سے لوٹ کر انھیں گندا گھر اچھا نہیں لگتا

پھر دروازوں کھڑکیوں کی کنڈیاں چٹخنیاں اچھے سے دیکھنا بھالنا، تالے چابیاں، نل بجلیاں وغیرہ ۔ سب کچھ مقفل کرنا۔ وہ کہتے ہیں کہ چیزوں کو میں ہی کر سکتی ہوں اور مجھے ہی کرنا ہے ان کے بس کی بات نہیں

دوسری صبح کچھ سوتے کچھ جاگتے ہم روانہ ہوئے اور دوپہر کو کالکا پہنچ گئے۔ وہاں سے

شملہ کے لیے ٹیکسی لی۔ منّو کو ان گھومتے بل کھاتے راستوں میں ابکائی ہو جاتی ہے۔ وہ سارا راستہ الٹیاں کرتا رہا میں اس کا سر تھامے رکھتی، منہ پونچھتی گریبان صاف کرتی رہی۔

وہ اگلی سیٹ پر شاید سو رہے تھے۔ ——— پہاڑی راستے اتنے دل موہنے والے تھے کہ سب تکان بھول کر ہیں ان اونچے اونچے پیڑوں کو ڈھلوانوں، گھاٹیوں کو دیکھنے لگے۔ کوئی ساڑھے تین گھنٹے کا سفر تھا۔ بوندیں پڑنے لگی تھیں جہاں جہاں گاڑی بڑھتی ذرا سا راستہ چھوڑ کر وہیں پر بارش پڑنے لگتی۔ بادل ہمارے ہی رُخ پر تیر رہے تھے۔ ہمارے ساتھ ساتھ چل کر مینہ برساتے جاتے۔ دونوں بچّے میرے دو کاندھوں پر سر ٹکائے سو رہے تھے۔ شاید اس ترنم کو لوری سمجھ کر جو بارش کے قطروں کے کھڑکیوں کے شیشوں سے ٹکرانے سے پیدا ہو رہا تھا۔ انھیں میٹھی نیند آگئی تھی۔ یہ منظر اس قدر دل کش تھا کہ میری بوجھل پلکیں بند نہ ہو رہی تھیں۔ زوروں سے برستا ہوا پانی سامنے کے شیشے پر چھا جاتا اور گاڑی میں لگا وائپر اسے پلک جھپکتے میں پونچھ لیتا اور اتنے ہی عرصے میں اس کی جگہ اور پانی لے لیتا اور پھر اسی طرح پونچھا جاتا۔ دونوں طرف کے شیشوں پر بھی بوندیں ٹکرا ٹکرا کر پھسل رہی تھیں۔ بارش سیدھی، آڑھی، ترچھی جانے کیسے کیسے بہہ رہی تھی۔ ایک طرف پہاڑیاں ایک طرف جنگل اور اگر جنگل کی طرف دیکھیں تو بارش آسمان سے لے کر زمین تک بنتی ہوئی ہزاروں پانی کی نہایت طویل دھاروں کی شکل میں رواں نظر آرہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ہم خود اوپر سے نیچے پانی کی بے شمار دھاریں برسا رہے ہوں۔ اندر ہلکی ہلکی گرمی تھی باہر ہوائیں، سردی اور بارش۔ تنہا بل کھاتی سرمئی طویل سڑک ——— مجھے نیند آرہی تھی ——— منظر کو نہارنا اچھا لگتا تھا مگر تکان کے باوجود میں نے خود کو سونے سے روکے رکھا تا کہ موڑوں پر مڑتے وقت بچّوں کو کہیں چوٹ ہی نہ لگ جائے ———

یہ جگہ شملہ سے آگے تھی۔ بیچوں بیچ جنگل کے۔ ویسے یہاں سب کچھ جنگل کے درمیان سی تھا۔ مگر یہاں قدرتی حسن اپنے شباب پر تھا۔ چھوٹی سی پہاڑی کے اوپر یہ خوبصورت سا ہوٹل پہاڑی کے شروع میں مختصر سا بازار۔

ٹیکسی سے اترتے ہی تازہ ہوا کے معطر جھونکوں نے ہمارا استقبال کیا۔ اس خوشبو میں جنگلی درختوں کی سوندھی سوندھی مہک بھی شامل تھی اور مختلف قسم کے پھولوں کی خوشبوئیں بھی۔ جو باغیچے میں چاروں طرف اور درمیان میں نہایت سلیقے سے اگائے گئے تھے۔ اس میں ایستادہ بڑے سے اخروٹ کے پیڑ پر ایک پہاڑی مینا اپنی پیلی چونچ وا کیے چہک رہی تھی۔ بارش تھم چکی تھی۔ نکھرے نیلے آسمان پر بادل کے دودھ ایسے سفید ٹکڑے ادھر اُدھر ٹنگے ہوئے تھے، سرمئی پنکھوں اور پیلے پیٹ والی ایک ننی سی چڑیا یہاں سے وہاں اڑ رہی تھی۔ آسمان پر قوسِ قزح ابھر آیا تھا۔ بچّوں نے پہلی بار دھنک کو دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ آس پاس حدِ نظر تک دھلا دھلایا سا منظر — نہائے نہلائے سے پیڑ، سجے سجائے شرمائے سے پھول۔ ہری ہری گھاس پر اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی رنگ برنگی تتلیاں۔ نیلا نیلا آسمان دیکھ کر گنگناتی ہوئی پہاڑی مینا — یہ منظر جانے کہاں لے گیا۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے سب کپڑے UNPACK ... کر کے الماری میں لٹکا دیے۔ بچّوں کو ہاتھ منہ دھلانے غسل خانے میں لے جانے لگی تو دیکھا کہ بادل اندر گھسے آ رہے تھے کھڑکی کے راستے۔ اس سے پہلے کہ میں اس ہوش ربا منظر میں محو ہو جاتی، میں نے بادلوں سے درخواست کی کہ کچھ اور دیر ایسے ہی ٹھہر جائیں۔ میں بچّوں سے فارغ ہو لوں، کہ میں یہ سحر آگیں منظر پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ وہ بالکنی میں کھڑے سگریٹ پھونک رہے تھے۔

کھانا کھاتے شام ہو گئی۔ شام سے مجھے عشق رہا ہے۔ چوبیس گھنٹوں میں شام ہی ہے جو مجھے اپنی سی لگتی ہے۔ پھر پہاڑوں کی شام کی بات کچھ اور ہی ہے۔ میں بالکنی میں بیٹھ کر بادلوں کو اپنے چہرے پر اپنے ہاتھوں پر محسوس کرنا چاہ رہی تھی کہ میں تین دن کے لیے بادلوں کے پاس اتنی اونچائی پر چلی آئی تھی۔ وہاں بیٹھ کر ذرا سا وہ میگزین دیکھنا چاہ رہی تھی جو میں نے اسٹیشن پر خریدا تھا — مگر

مگر ان کی سگریٹ ختم ہو گئی تھی اور ہوٹل میں وہ برانڈ نہیں تھا۔ انھوں نے مجھے، ہی بھیجنا مناسب سمجھا۔ کہنے لگے کہ بچّوں کو بھی ساتھ لے جاؤں بازار۔ راستہ بھی دیکھ لوں گی اور

سیر بھی ہو جائے گی ۔ وہ تب تک بالکونی میں بیٹھ کر میگزین دیکھیں گے ۔ انھوں نے آہستہ
سے میرے ہاتھ سے رسالہ لیتے ہوئے سمجھایا تھا۔
بازار دور سے نظر آ رہا تھا۔ ہمارے چلتے وقت آسمان پھر ابر آلود تھا۔ مگر بوندیں
اتنی باریک بار یک برس رہی تھیں جیسے چھلنی میں سے چھن کر گر رہی ہوں ۔ ہم ڈھلان طے کر کے
چوڑی سڑک پر پہنچے ہی تھے کہ بارش اچانک ہی تیز ہو گئی۔ اور ہم سب ایک دکان کے چھجے
تک پہنچتے پہنچتے بری طرح بھیگ گئے۔ کچھ دیر بعد جب بارش ذرا کم ہوئی تو جلدی سے سگریٹ
اور کچھ بسکٹ وغیرہ لے کر میں گڑیا کو گود میں لیے منّو کی انگلی تھامے اوپر چڑھائی چڑھنے لگی۔
سرد ہوا بدن کو چھوتی ہوئی لباس کے آر پار ہو کر گزر رہی تھی ۔ مگر میں پسینہ پسینہ ہو رہی تھی ۔
سانس بے ترتیب چل رہا تھا۔ منّو بھی بار بار رک رہا تھا۔ اگر وہ ذرا سا ڈھلان تک آجاتے
تو گڑیا کو سنبھال لیتے یا منو کو ہی سہارا دے کر اوپر لے جاتے
ہانپتے کانپتے جب ہم اوپر پہنچے تو وہ مسہری پر نیم دراز گرم گرم چائے پی رہے تھے۔
ٹی ۔ وی ON تھا۔ کوئی پرانی فلم آ رہی تھی ۔ فلم کی ہیروئن نرگس ایک ننھے سے بچّے کو پیٹھ
پر باندھے، کدال سے پتھر ایسی سخت زمین کھود رہی تھی ۔ وہ نہایت پرسکون تھے انھوں
نے ہم لوگوں کی طرف دیکھے بغیر سگریٹ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔
میں نے جلدی سے بچّوں کے بال پونچھ کر ان کے کپڑے تبدیل کیے۔ پھر اپنے۔ گڑیا
کی کپکپاہٹ بڑھتی جا رہی تھی ۔ میں نے اسے کمبل اوڑھا کر ان کے برابر لٹا دیا۔ کچھ دیر
بعد وہ بولے کہ گڑیا کو بخار آ رہا ہے ۔ چھوا تو وہ تپ رہی تھی ۔ میں نے اسے اور منّو دونوں کو
کروسین سرپ کا ایک ایک چمچ پلا دیا۔ اس کے نازک سے ننھے وجود کو سردی ہو گئی تھی ۔
اس دن پوری رات وہ بے چین رہی ۔ میں بیچ بیچ میں دوائی بھی پلاتی رہی ۔ ٹھنڈے پانی کی
پٹیاں بھی کرتی رہی ۔ صبح کے وقت جب اس کا بخار کم ہوا تو وہ سو گئی۔
یہاں تو یوں بھی مجھے کوئی کام نہیں ۔ نیند آئے گی تو دن میں بھی سو سکتی ہوں ۔ مگر میں سو کر
اس حسین منظر کی توہین نہیں کرنا چاہتی اور نہ ہی آنے والے دن کو نیند کے حوالے کر کے ضائع
کروں گی ۔ میں اسے محسوس کرنا چاہتی ہوں ۔ میں ہرگز نہ سوؤں گی ۔

سحر ہونے کو تھی مگر ابھی باہر گھپ اندھیرا تھا۔ قریب ہی کسی پیڑ پر کوئی پرندہ گا رہا تھا۔ اتنی صبح۔ یعنی صبح سے بھی پہلے یہ کون سا پرندہ گا سکتا ہے۔ اتنا میٹھا نغمہ۔ ایک مسلسل گیت۔ سُر اور لَے سے بھرپور۔ میں اٹھ کر کھڑکی تک آگئی۔ میں نے اندھیرے میں غور سے دیکھا۔ سیاہی مائل نیلے پروں اور پیلی چونچ والی پہاڑی مینا گھاس پر ادھر ادھر کبھی چل کر کبھی پھدک کر چہل قدمی کر رہی تھی اور کبھی رک کر سر اوپر اٹھائے اس سُریلے نغمے کا الاپ کر رہی تھی جو اس گہرے سکوت کو توڑ کر روح کی گہرائیوں میں گھلا جا رہا تھا۔ یہ منظر اتنا ہوش ربا تھا کہ میرے پاؤں کھڑکی کے پاس جیسے کہ منجمد ہو گئے۔ صبح کاذب کے نئے نئے متوقع اسرار سے محظوظ ہونے کے لیے میں وہیں کھڑی رہی۔ ذرا سی دیر میں پو پھٹا چاہتی تھی۔ مینا اصل میں اتنی صبح باغیچے میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں اتری تھی ورنہ وہ ڈال پر بھی تو گا سکتی تھی۔ وہ ان ننھی منی بیر بہوٹیوں کے لیے صبح صبح پیغام اجل لے کر نمودار ہوئی تھی جو گھاس کے ایک منے سے تنکے کی اوٹ میں کچھ گھنٹوں کی زندگی گزارا کرتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے وہ شوق سے کھایا کرتی ہے۔ پہروں گھاس پر اِدھر اُدھر گھوم کر انھیں تلاش کرتی۔ تھک جاتی تو اڑان بھر کر پاس کے پیڑ پر بیٹھ کر نغمہ چھیڑ دیتی۔ جیسے کوئی مختلف سروں میں سیٹیاں بجا رہا ہو اور ساتھ ہی چہک بھی رہا ہو۔ کچھ سیٹیاں ایک چہک، پھر سیٹیاں پھر چہک ــــ روشنی پھیلنے لگی تھی۔ پرندے جاگ گئے تھے۔ کسی شاخ پر بھورے سرمئی پروں اور پھرتیلے جسم والی کستوری لہک لہک کر گا رہی تھی۔ پی۔ پی۔ پی پیو پیو۔ کئی طرح کی مختلف بولیاں بول رہے تھے پرندے۔ کئی طرح کی بلبلیں گا رہی تھیں۔

کچھ ہی دیر میں دھند نے سارے منظر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دراصل، یہ دھند نہیں تھی۔ یہ بادل تھے جو ہمیں میدانی علاقوں میں بہت اوپر پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں ورنہ اگر یہ صرف دھند ہوتی تو صرف دھند ہی ہوتی۔ ساتھ میں بارش بھی ہونے لگی تھی۔ پرندے خاموش سے ہو گئے تھے۔ مگر وہ پہاڑی مینا اب بھی گھاس پر بھیگ بھیگ کر گھوم گھوم کر نغمے گا رہی تھی۔ نہ وہ بھیگنے سے گھبراتی نہ سردی سے۔ جی چاہ رہا تھا کہ نیچے باغیچے میں اتر کر میں بھی ذرا سا ٹہل کر تھوڑا سا بھیگوں اور اس دھلی دھلائی نکھری نہائی صبح کو اپنی روح میں

اتاروں مگر مسلسل کئی گھنٹوں کی تھکان اور شب بیداری نے میرے پاؤں مَن مَن بھر کے کردیے۔ آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں میں واپس مسہری پر آگئی۔

چھت کے اوپر زوروں کی کھڑکھڑاہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ کھڑکی سے جھانکا تو دھوپ چمک رہی تھی اور ٹین کی چھت پر کودتے اچھلتے بندروں کا سایہ باغیچے کی گھاس پر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کمرے میں نہیں تھے۔ شاید منّو بھی ان کے ساتھ گیا تھا۔

گڑیا چپ چاپ سو رہی تھی۔ ننھی سی جان کو بخار نے کمھلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کا پھول سا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ وہ پیلی پڑگئی تھی، ہونٹ سوکھے ہوئے تھے۔ اگر ٹھیک ہوتی تو اپنے قد کی ہر چیز کا اس نے بھرپور جائزہ لیا ہوتا کہ ابھی ابھی کھڑا ہونا سیکھا تھا اس نے۔ ایش ٹرے جو اس کے برابر اونچی میز پر سلیقے سے ایک طرف کو سج رہی تھی، فرش پر اوندھی پڑی ہوتی اور سگریٹ کے بچے ہوئے ٹکڑے کچھ زمین پر ہوتے کچھ اس کے منہ میں۔ جگ الٹا ہوا ہوتا اور گلاس گرا ہوا۔ دو منٹ میں اس کے سارے کپڑے بھیگے ہوئے ہوتے اور مجھے دیکھ کر ہنس ہنس کر کبھی مسہری کے نیچے گھسنے کی کوشش کرتی کبھی میز کے نیچے۔ اور میں وہاں سے اس کے گول مٹول مکھن ایسے پیروں کو کھینچ کر اسے باہر نکالتی۔ اس کا دہانہ صاف کرتی، منہ سے سگریٹ کے بچے ہوئے ٹکڑے نکال کر اسے خوب خوب پیار کرتی —— مگر اس بخار نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔

میں نے پانی پلانے کے خیال سے اس کے چہرے کو چھوا۔ وہ اب بھی ہلکا سا گرم تھا۔ میں نے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔ پسینے کی وجہ سے نرم نرم بال ماتھے سے چپک گئے تھے۔ اس نے نحیف سی آواز میں مجھے پکارا۔ میں نے دو تین چمچ پانی پلایا۔ اس نے مشکل سے پیا۔ اس وقت بھی اسے بھوک نہیں تھی۔ کل رات بھی اس نے کچھ نہ کھایا تھا۔ میں نے بسکٹ کھلانے کی کوشش کی تھی تو اس نے بری سی شکل بنا کر منہ پھیر لیا تھا۔ اور اب وہ بہت نحیف لگ رہی تھی۔ اس وقت وہ کچھ دیر کے لیے آجائیں تو میں بازار جا کر کچھ دلیا وغیرہ لے آتی۔ دوا سے کچھ دیر کے لیے جب اس کا بخار اترے گا تو میں اسے دلیا کھلا دوں گی۔ دوپہر ہوگئی وہ نہیں لوٹے۔ نیچے وہ کہہ گئے تھے کہ میرا کھانا کمرے میں بھجوا دیں۔

سارا دن بخار میں تپتی ہوئی گڑیا کو سینے سے لپٹائے میں خود بھی تڑپتی رہی۔ وہ بھوکی تھی تو مجھ سے کہاں کھایا جاتا کچھ۔ میں نے ویٹر سے دودھ اوپر کمرے میں منگوایا تھا، اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تک نہیں۔

صبح موسم خوشگوار تھا پھر معلوم نہیں کب بادل چھائے مطلع ابر آلود ہو گیا۔ ہوا کے جھونکے نے کھڑکی کا پٹ کھٹ سے کھول دیا تو میں نے گردن موڑ کر دیکھنا چاہا مگر اس وقت گڑیا نیند یا غنودگی یا بخار میں مجھے پکار کر چیخی۔ میں نے ہلا کر جگا دیا۔ پانی کے دو چمچ پلائے، کچھ بات کرنا چاہی۔ وہ نیم وا سی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں مسکرائی تو وہ بھی دھیرے سے مسکرائی۔ میں اس کا مکھڑا دیکھ رہی تھی۔ حرارت کچھ کم تھی۔ میرا دل پرسکون ہونے لگا۔ اب شاید وہ دودھ پی لے گی۔ کچھ تازہ سی خوشبوئیں محسوس ہوئیں تو میں نے نظر اٹھا کر دیکھا کہ ہوائیں کمرے کے اندر چلی آ رہی تھیں۔ میں نے پہلی بار ہواؤں کو دیکھا تھا۔ پہلی بار اس کی خوشبو سونگھی تھی۔ مجھے اپنی قوتِ شامہ اور باصرہ پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ کیا ہوا کو دیکھا جا سکتا ہے؟ ہاں ہوا کو دیکھا جا سکتا ہے۔ جب وہ بادلوں کے بے شمار خوردبینی ذرات پر سوار ہو کر آئے۔ اور ہوا کو سونگھا بھی جا سکتا ہے — جب وہ جنگل کے عظیم درختوں کے نوکیلے پتوں کی سوندھی مہک اور رنگ برنگے پھولوں اور ہری ہری گھاس کی نمی اور خوشبو اپنے ساتھ لے کر چپکے سے کھڑکی سے داخل ہو۔ کچھ دیر میں اس جنت میں گم ہو گئی جو بغیر بتائے کمرے میں آ کر مجھے سرشار کر گئی۔

میں نے دو تکیوں کی مدد سے گڑیا کو بٹھا کر چاروں طرف سے کمبل اوڑھا دیا۔ باہر زوروں کی بارش ہو رہی تھی۔ ایک پہاڑی مینا اڑتی آئی اور کھڑکی پر بیٹھ کر گانے لگی۔ اسے تو بہانہ چاہیے گانے کا۔ بادل چھائیں تو گائے گی۔ بادل نہ چھائیں تو گائے گی۔ بارش برسے تو گائے گی بارش تھم جائے تو گائے گی۔ سورج چڑھے تو گائے گی اور ڈوبے تو بھی۔ بلکہ سورج چڑھنے سے گھنٹوں پہلے منہ اندھیرے گانے لگے گی اور اسی طرح سورج غروب ہونے کے گھنٹوں بعد تک جب تک گھپ اندھیرا نہ ہو جائے اور کچھ بھی نظر نہ آنے لگے، تب تک گاتی جائے گی۔ ایسا بھی دیکھا ہے کہ بجلی کڑکتی ہے اور یہ چہکتی ہے اور بادلوں کی

زور دار کھردری دہاڑ میں بھی اس کا نہایت سریلا نغمہ کانوں میں رس گھولتا، گرج کو چیرتا ہوا سنائی دیتا ہے۔ میں نے ایسا خوش مزاج پرندہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ گاتی ہوئی پہاڑی مینا کا نغمہ یا اس کی پیلی چونچ یا پھر سیاہی مائل نیلے پروں کی کشش تھی کہ گڑیا اس کا محویت سے مشاہدہ کرنے لگی۔ میں نے اس کی اسی محویت کا فائدہ اٹھا کر اسے چار چھ چمچ دودھ کے پلا دیے۔ اور خود چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتے ہوئے مینا کو دیکھنے لگی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے چائے پیوں۔ مگر مینا کے اڑ جانے کے ڈر سے میں وہیں گڑیا کے پاس مسہری پر بیٹھ گئی۔ مینہ زوروں کا تھا ساتھ ہی موٹے موٹے اولے بھی پڑ رہے تھے مینا کہیں اڑ گئی تھی۔ میں نے کھڑکی کے قریب جاکر بارش کے قطروں کو ہاتھ میں لینے کے لیے ہاتھ پھیلا دیا بڑی مشکل سے ایک اولا میری ہتھیلی پر رکا عجیب سی خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے کہ میں ہوا کے دوش پر تیر رہی ہوں یا اپنے لڑکپن میں کہیں لوٹ آئی ہوں ـــ نہیں لوٹ آیا چاہتی ہوں کہ دروازے کی دستک نے مجھے احساس دلایا کہ مجھے تیرنا نہیں آتا۔ وہ دونوں باپ بیٹے اندر داخل ہوئے۔

" بہت مزا آیا ماما۔ آپ کیوں نہیں آئیں ہمارے ساتھ گھومنے۔" منو مجھ سے لپٹتے ہوئے بولا۔

" گڑیا ٹھیک ہو گئی ؟" وہ بولے۔

" کچھ بہتر تو ہے۔" میں نے جواب دیا۔

" بہت تھک گئے ہم۔ ذرا روم سروس میں چائے کے لیے فون کر دیجیے۔" وہ بستر پر دراز ہوتے ہوئے بولے۔ وہ واقعی تھک گئے تھے کہ اس طرح جوتوں سمیت بستر پر لیٹنے کا مطلب تھا کہ میں ہی ان کے جوتے کھولوں، موزے اتاروں۔

جوتوں موزوں سے فارغ ہو کر میں نے منے کو نہلا دیا۔

رات کا کھانا ہم سب نے نیچے ڈائننگ ہال میں کھایا۔ باہر آئے تو میں نے پہلی بار آسمان کی طرف دیکھا تھا۔ آسمان پر بے شمار تارے تھے کہ شہر کے آلودہ آسمان پر تو بہت تھوڑے

تارے ہوا کرتے ہیں جو بہت چھوٹے دکھائی دینے والے تارے ہوتے ہیں، وہ مٹ میلے دھوئیں کے غلاف کے اس پار دِکھتے ہی نہیں۔ جو دکھائی دیتے ہیں وہ بھی میلے میلے سے۔ اور یہاں کتنا چمکدار آسمان — اور ایک دوسرا آسمان وہ جو زمین پر بھی نظر آرہا تھا۔ رات کو پہاڑیوں کے اونچے نیچے مقامات پر بنے مکانات کی بجلیاں دور ہوا سے ہلکورے کھانے والے ان گنت پتوں کے پیچھے سے یوں آنکھ مچولی کر رہی تھیں جیسے رنگ برنگے ستارے ٹمٹما رہے ہوں۔ بہت ہی لبھاؤنا منظر تھا۔ یہ نظارہ اگر شام کی سرمئی روشنی میں دیکھا جائے تو کتنا زیادہ حسن سمیٹ لے گا اپنے اندر۔ اس وقت تو نیلا آسمان بھی گہرا نیلا دکھائی دیتا ہوگا اور پرشکوہ درختوں کے اسرار بھی واضح ہوں گے۔ تب یہ روشنیاں دور سے ایسی لگتی ہوں گی جیسے درختوں کی شاخوں پر ان گنت جگنوؤں کے جھرمٹوں نے ڈیرے ڈالے ہوں۔

اس اندھیرے میں اونچے لمبے ٹیلوں والی پہاڑیوں پر یہاں وہاں جیسے آرزوؤں کے بے شمار دیے جھلملا رہے ہوں۔ دو دن تو جانے کیسے گزر گئے۔ کل شام میں یہ منظر ہرگز زائل نہ ہونے دوں گی۔ سورج کو غروب ہوتا ہوا دیکھوں گی۔ ان تمام پرندوں کو پاس کے سبھی درختوں پر غور کر کر کے تلاش کروں گی جو یہ دل چرانے والی چہکار جگا کر ہمیں سکون کی وادیوں کی سیر کراتے ہیں۔ اپنے روح پرور نغمے سنا کر مدہوش کر دیتے ہیں کہ ہمیں اپنا آپ ہلکا پھلکا محسوس ہوتا ہے۔ سارے غم، سارے کام ساری ذمہ داریوں کے احساس پر سکون کا احساس حاوی رہتا ہے کہ سکون کی اب میرے نزدیک وہ اہمیت ہے کہ معصوم زندگیوں کی بے شمار ضرورتوں کی فکر نہ ہوتی — تو جان کے بدلے خرید لیتی۔ اور یہ خوش رنگ و خوش گلو پرندے، بے دام میری جھولی میں یہ دولت ڈال دیتے ہیں کہ زندگی کوئی اچھی چیز معلوم ہونے لگتی ہے۔

یوں بھی نہیں کہ زندگی مجھے ہمیشہ جھیلنی پڑتی تھی، بلکہ میں نے تو زندگی سے خوب خوب محبت کی تھی۔ زندگی میرے لیے ہنسی کے نہ رکنے والے فوارے، ماں باپ کی ناز برداریاں، ننھے منے بھتیجوں کے ساتھ عشق، بھائیوں کا لاڈ اور بھابیوں کے ساتھ سیر سپاٹے، شاپنگ اور فلموں کے علاوہ پینسل اسکیچنگ کرنا اور پڑھائی کرنا تو خیر تھا ہی۔

اب تو اخبار تک کی شکل دیکھے ہفتوں گزر جاتے ہیں۔

وہ بھی ٹھیک ہی کہتے ہیں

کرنا ہی کیا ہے۔ کوئی سوشل لائف تو میری ہے نہیں۔ نہ دوست نہ سہیلی۔ جو احباب وغیرہ ہیں تو ان ہی کی طرف سے ہیں۔ ان سے اگر کبھی ہمارے ہاں ملاقات ہوتی ہے تو مجھے فرصت ہی نہیں ہوتی پاس ٹھہرنے کی۔ اور ان میں سے کسی کے ہاں وہ صرف خود ہی جا پاتے انھیں اس بات سے بڑی کوفت ہوتی ہے کہ وہ دوستوں سے بات کر رہے ہوں اور بیچ میں بچے کے رونے کی آواز آجائے یا بچہ زور سے ہنس پڑے۔ اس لیے میں بچوں کو اپنے پاس ہی رکھتی ہوں۔

باہری دروازے کی چابی ساتھ نہیں لے جاتے وہ انھیں اچھا نہیں لگتا کہ وہ خود سے دروازہ کھول کے اندر داخل ہوں اور میں سوئی ہوئی ملوں۔ میں بیٹھے بیٹھے اونگھ بھی جاؤں تو لیٹتی نہیں تاکہ وہ گھر لوٹیں تو دروازہ کھولوں اب دوست کے گھر جائیں گے یا ان کے ساتھ کہیں جائیں گے تو یہ آدھی وادھی رات تو ہو ہی جاتی ہے۔ تھک بھی جاتے ہیں۔ ان کو کپڑوں کی الماری کے دروازے پر لگے ہینڈل پر ہینگر میں ٹنگا شب خوابی کا لباس پکڑانا ہوتا ہے موزے اور قمیض وغیرہ کپڑے دھونے کی مشین میں پھینکنا۔ اور کچھ کپڑے اسی ہینگر پر ڈال کر الماری میں رکھ دینا۔ جوتے جو یہ ریک کے ٹھیک پاس اتارتے ہیں انھیں اٹھاکر قرینے سے ریک کے اندر رکھنا۔ گھر میں چار لوگ ہیں۔ اور پھر مجھے ایسا کرنا ہی کیا ہوتا ہے۔

بہر حال کل کا دن میرے پاس ہے۔ کل رات کی گاڑی سے جانا ہے۔ معلوم نہیں وہ اور منو کل کہاں گھومنے گئے تھے۔ آس پاس دیکھنے لائق مقام تو ہوں گے۔ دن میں کچھ نہ کچھ تو دیکھ ہی سکتی ہوں۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی میں فوراً پیکنگ کر لوں گی۔ مگر کیا معلوم وہ کتنے مصروف ہوں۔ انھیں کہیں جانا ہو۔ میں کبھی کوئی پروگرام بنا نہیں پاتی

ناشتے کے بعد جب میں پیکنگ کرنے لگی تو انھوں نے مشورہ دیا کہ یہ جو پلاسٹک کی تھیلی میں میں نے بچوں کے میلے کپڑے ساتھ اٹھا لیے ہیں، انھیں یہاں ہی دھو لوں۔ کہاں میلے کپڑوں کو اٹھاتی پھروں گی۔ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ اب میں ان کو یہ کہہ کر پریشان تو نہ کرتی کہ یہ سوکھیں گے نہیں شام تک اور تب بھی تھیلی میں الگ سے ڈالنے پڑیں گے،

خیر میں نے پیکنگ کا کام ادھورا چھوڑ دیا اور کپڑے دھونے لگ پڑی۔ دھوتے دھوتے جانے کب دوپہر ہوگئی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ کسی طرف نکل گئے اور میں پیکنگ میں لگ گئی۔ اٹیچی بڑی مشکل سے بند ہوئی۔ اصل میں اس میں ان کے ملنے والوں کے لیے کچھ چھوٹے موٹے تحائف وغیرہ تھے۔ یہ ایک اضافہ تھا۔ اور بیگ میں بھی بھیگے کپڑوں نے ایک بڑی جگہ گھیر رکھی تھی۔ بچّوں کو میں نے سفر کے لیے چاق و چوبند بنا دیا۔ خود بھی تیار ہوگئی۔ وہ تو تیار ہی تھے۔ سب سامان پیک ہو چکا تھا بلکہ اپنی اپنی جگہ پر ٹھنس چکا تھا۔ پانچ بجنے والے تھے۔ شکر ہے سب کاموں سے نبٹ تو لی۔ اِدھر اُدھر نہ سہی، آرام سے بالکنی پر وہ رسالہ دیکھوں گی جو تین دن پہلے میں نے خریدا تھا۔ اس کے بعد غروبِ آفتاب کا نظارہ پھر پرندے ــــ

اس خیال سے میں نے گڑیا کو انگلی پکڑائی اور دھیرے دھیرے چلاتی ہوئی بالکنی میں پہنچی ہی تھی کہ نیچے سڑک پر وہ آتے ہوئے دکھائی دیے۔ میں واپس کمرے میں لوٹ آئی۔ وہ آتے ہی کہنے لگے کہ ان کی جین کافی میلی لگ رہی ہے۔ اور یہ کہ انھیں جین میں ہی سفر کرنا اچھا لگتا ہے۔ اس لیے میں ذرا سا اسے دھولوں۔ جین دیکھنے میں میلی تو نہیں لگ رہی تھی، بس موریوں پر ذرا سی دھول مٹی تھی جو برش سے بہ آسانی صاف ہو سکتی تھی مگر وہ بہت صفائی پسند ہیں! کہہ رہے تھے کہ مجھے بھی گاڑی کا وقت ہونے تک کچھ کرنا تو ہے نہیں۔ ذرا سا اسے دھولوں گی اور پھر ذرا سا استری سے سکھا بھی دوں گی۔ اتنا وقت ہے میرے پاس۔ میں نے پریس ساتھ نہ رکھی تھی۔ وہ ایک آدھ شکن والا لباس بھی نہیں پہن سکتے۔

میں نے نہایت مشکل سے پیک کی ہوئی اٹیچی کھول کر انھیں دوسری پتلون نکال دی، اور جین کی پینٹ دھونے غسل خانے میں گھس گئی۔ موٹے کپڑے کی جین پانی میں اور بھی بھاری ہوگئی اور میں حتی الامکان اس وزنی پینٹ کو الٹ پلٹ کر دھوتی گئی۔ ہاتھوں میں لے کر رگڑتی گئی۔ کپڑے دھونے کا برش تو میرے پاس تھا نہیں اس طرح اور زیادہ صاف کرنے کی کوشش میں میری انگلی کا ایک لمبا ناخن آدھا ٹوٹ گیا۔ جانے کتنا وقت لگا ہوگا مگر میں نے اسے آخر کار دھولیا۔ اور اب اسے پھیلانے سے پہلے جھٹکتے ہوئے

میرا پورا ناخن ہی اکھڑ گیا۔
خون کی دھار بہہ نکلی۔ درد کی لہر سی اٹھی۔ میں نے انگلی پر ٹیشو پیپر لپیٹ دیا۔ اور وقت ضائع کیے بغیر غسل خانے کی کھڑکی کھول دی۔
اندھیروں کو چیر کر آتا ہوا سرد ہوا کا ایک افسردہ جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا۔
نہ معلوم کب اندھیرا ہو چکا تھا۔ سارے طیور آشیانوں میں جا چھپے تھے۔ نیلے پنکھوں اور پیلی چونچ والی مینا بھی غائب تھی۔ انگلی کی ٹیس دل میں سے ہوتی ہوئی روح میں سما سی گئی تھکی ہوئی نظر میں نے آسمان کی طرف اٹھائی۔
ستارۂ مشتری وسیع العرض آسمان پر اکیلا لٹک رہا تھا۔ دور پہاڑیوں پر ٹنگی روشنیاں بھی برائے نام دکھائی دے رہی تھیں۔ ہر طرف دھند ہی دھند تھی۔
تھکی ہاری سی میں کمرے کی طرف پلٹی، تو کمرے کا منظر بھی مجھے دھندلایا سا لگا۔ یہ میری آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے۔
__ جین کی پتلون کا اضافی پانی نچڑ چکا ہوگا۔ مجھے اسے استری سے سکھانا بھی ہے وہ بہت نازک مزاج ہیں۔ ذرا سی بھی UNCOMFORTABLE چیز انھیں پریشان کر دیتی ہے۔

حُور

مجھے دولہا دیکھ کر نہایت مایوسی ہوئی۔ وہ ناٹے سے قد کا مضبوط جسم والا کوئی تیس ۳۰ بتیس ۳۲ سال کا نوجوان تھا۔ کچھ اکڑا سا گھوڑے پر سوار پنڈلیوں کے پاس سے ٹانگیں قوس کی شکل میں خم کھائی ہوئیں۔ چہرے کے نقوش موٹے موٹے۔
وہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی خوش نظر آرہا تھا۔ بار بار وہ اپنے داہنے ہاتھ سے جس میں چھ انگلیاں تھیں، اپنے سر پر بندھا سہرا ہٹا ہٹا کر استقبال کرنے والوں کو دیکھ دیکھ کر مسکراتا۔ سارے لڑکی والے اس کے آگے پیچھے بچھے جا رہے تھے۔ ویسے اس کی اس قدر خوشی تھی بھی حق بجانب کہ اس کا بیاہ شریفہ سے جو ہو رہا تھا ع

چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک

وہ میری بڑی بہن کی سہیلی تھی۔ اپنا زیادہ تر وقت وہ ہمارے ہاں ہی گزارتی۔ کبھی گھر کے پچھواڑے جہاں شہتوت کے ایک بوڑھے درخت کی سب سے اونچی موٹی سی ڈال کے ساتھ پینگ لٹکا کرتی، وہ آپا کے ساتھ گھنٹوں جھولا جھولتی۔ باہر گھر کے سامنے والے احاطے میں، جس کی بہت اونچی دیوار سے انگور اور عشق پیچاں کی بیلیں اپنی ہری ہری باہیں پھیلائے لپٹی رہتیں وہ دونوں دیوار کے ساتھ لگی سر جوڑے بیٹھتیں، اور چھوٹی چھوٹی لکڑیوں اور انگور کی سوکھی ننھی ننھی ٹہنیوں سے گھر بنایا کرتیں۔ تب میرا کام اِدھر اُدھر سے ٹہنیاں اکٹھی کر کے انھیں دینا ہوتا تھا۔ میرے لیے اتنا ہی بہت تھا، اور کبھی منت سماجت کے بعد اگر گھر کی تعمیر میں ایک آدھ لکڑی چننے کی اجازت مجھے بھی مل جاتی تو سمجھیے کہ میری عید ہو جاتی۔ کھیل کے دوران وہ

دونوں دیواریں بنی جالی کے باہر سڑک پر اکا دکا آتی جاتی کسی گاڑی، تانگے، یا سائیکل کو دیکھا کرتیں، آپا کی اور اس کی عمر تقریباً برابر تھی۔ یہ ہی کوئی بارہ سال۔ آپا اسکول سے آتے ہی اسے تلاش کرنے لگتیں، وہ سکول نہیں جاتی تھی۔ گھر میں قرآن شریف پڑھا تھا اس نے۔ ان کے ہاں سکول میں پڑھنے کا رواج نہ تھا۔ ہمارا گھر سڑک کے کنارے پر تھا۔ اور گھر کے مشرقی دروازے کے پاس سے جو گلی شروع ہوتی تھی، اس گلی میں کوئی دس گھر چھوڑ کر ان کا چھوٹا سا مکان تھا اور ہمارے گھر کے سامنے والے گیٹ کی بائیں جانب اس کے والد عزیز بٹ کی لکڑی کی مصنوعات کی دکان تھی۔ کبھی کبھی ان کی چھوٹی بہن جس کا نام حور تھا۔ ہمارے ہاں سے بلا کر اسے لے جاتی۔ حور تھی تو میری ہم عمر مگر میری اس سے کوئی دوستی نہ تھی۔

حور — جانے کیا سوچ کر گھر والوں نے اس کا نام حور رکھا تھا۔ موٹی سی ناک، دانت باہر کو جھانکتے ہوئے، اور آنکھیں — بس غنیمت — گوری ضرور تھی۔ مگر گوری تو ہمارے وہاں کی سبھی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ میرا جی چاہتا کہ دونوں کے آپس میں نام بدل لوں۔ اس حور کو شریفہ بلاؤں۔ شریفے کے چھلکے جیسی کھردری سی۔ ہاں اس کی بڑی بہن شریفہ مجھے ضرور حور سی لگتی۔ مگر میری سنتا کون۔

بھلا میں حور سے کیوں کھیلتی۔ شریفہ سے کیوں نہ کھیلتی۔ شریف سی شریفہ۔ گلابی رنگت اور گھنگھریالے بالوں والی۔ پیاری سی لڑکی۔ اس کی اماں کتنا ہی کس کر اس کی چٹیا گوندھتی، مگر اس کے بال بکھر بکھر جاتے، جانے کیسے۔ کچھ پیچدار لٹیں ماتھے پر آرہی ہیں، تو کچھ خمدار زلفیں کانوں کی لوؤں کے پاس بالیوں کی طرح جھوم رہی ہیں، اور یہ آپا تو اسے کبھی میرے ساتھ کھیلنے نہ دیتیں۔ آپا ہمیشہ خود کو بلند و بالا ظاہر کرنے کی کوشش میں لگی رہتیں۔ بقول آپا کے میں ان کے معیار کے مطابق کھیل نہیں پاتی تھی۔ آپا اسے کھیلنے میں اکثر ڈانٹتیں اور جھوٹ موٹ کی بازی لے جاتیں۔ اور وہ بڑی شرافت سے ہار تسلیم کر لیتی۔ ذرا بھی رنجیدہ نہ ہوتی۔ وہ آپا کی چالاکی سمجھتی تھی یا اتنی بے وقوف تھی کہ کچھ بھی نہ سمجھتی، اس بات کا فیصلہ میں آج تک نہ کر پائی۔ خیر جو بھی تھا مگر میں اس کے کھیلنے کی اس ادا پر فدا تھی اور اکثر آپا کی موت کی دعائیں مانگتی کہ کب آپا مریں اور میں شریفہ کے ساتھ کھیل کھیل کر جیتتی چلی جاؤں۔ پھر جانے کیا ہوا۔ شریفہ کچھ دنوں

سے نظر ہی نہیں آئی۔ بے چاری آپا کو بیکار اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے، کنکروں کو ٹھوکریں مارتے ہوئے دیکھ کر مجھے بڑا لطف آتا۔

ہمیں کسی کے گھر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ آپا نے میز کے سہارے باورچی خانے کے سب سے اونچے طاقچے پر رکھے شیشے کے بڑے سے مرتبان میں سے لیمو کے میٹھے اچار کی کئی بڑی بڑی قاشیں نکال کر مجھے رشوت کے طور پر دیں اور پچھواڑے کے دروازے سے مجھے شریفہ کے گھر کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھیج دیا۔ خود دروازے کے پاس دبکی بیٹھی پہرہ دیتی رہیں کہ کسی کو ہماری اس سازش کا پتہ نہ چلے۔

عزیز بٹ کے گھر پہنچی تو دروازہ کھلا ملا۔ دروازے کے عقب میں چھوٹے سے آنگن کے کونے میں ایک ۱۵، ۱۶ سال کا نہایت خوبرو لڑکا بیٹھا اخروٹ کی لکڑی سے بنے ایک سنگھار دان پر چھینی سے کرید کرید کر، کھود کر اور چھیل چھیل کر بیل بوٹے نقش کرتے ہوئے اب ایک ادھوری بلبل کے پر مکمل کر رہا تھا۔ اس کی چھینی اس لکڑی پر اتنی آسانی سے پھسل رہی تھی جیسے میری انگلیاں کیاریوں کی نرم مٹی پر تصویریں بناتے ہوئے کبھی کبھی پھسلا کرتیں۔ اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور مسکرا کر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ میں نے بھی مسکرا کر پوچھا کہ شریفہ کہاں ہے تو وہ کچھ بولا ہی نہیں۔ میں اس کے سامنے اکڑوں بیٹھ گئی اور پھر بولی۔ شریفہ کہاں ہے تو وہ میرے ہونٹوں کی جنبش کو غور سے دیکھنے لگا۔ پھر ہاتھ سے اندر کی طرف اشارہ کیا۔ کیا یہ گونگا بہرہ ہے؟ اتنے خوبصورت چہرے اور جادو بھری انگلیوں والا یہ فنکار کیا واقعی سن بول نہیں سکتا۔

اندر فیروزی رنگ ملی ہوئی ملتانی مٹی سے پُتے ہوئے ایک چھوٹے سے شفّاف کمرے میں شریفہ جھیل میں اُگی لمبی لمبی گھاس سے بنی ہوئی چٹائی "وگو" پر بیٹھی کرم کا ساگ چُن رہی تھی۔ ٹھنڈے ٹھنڈے بھیگے بھیگے ساگ کو چنتے چنتے جب اس کے ہاتھ سرد ہونے لگتے تو وہ اپنے دونوں ہاتھ سمیٹ کر اپنے پھرن کی آستینوں کے اندر کھینچ لیتی اور اپنی گلابی گلابی انگلیوں سے کانگڑی کے ہتھے تھام لیتی اور اس لطیف آنچ سے آسودہ ہو کر پھر ساگ چننے لگتی۔ اس نے کانگڑی پھرن سے باہر نکال دی اور اس میں پڑے ہوئے اپلوں کی گرم راکھ کو

کانگڑی کے ساتھ بندھی ہوئی لوہے کی چمچی "ژالن" سے الٹ پلٹ کرتے ہوئے بتایا کہ اس کا پردہ ہوگیا ہے۔

یہ سن کر میں پریشان ہوگئی۔ کیونکہ ہمارے وہاں پردے کا مطلب کچھ برس کے لیے مکمل طور پر پوشیدہ ہوجانا ہوتا تھا۔ شادی ہو یا غمی، گھر کے باہر کسی صورت میں قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی۔

مجھے ابھی تک یاد ہے ایک دن پڑوس کی نسیمؔ کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا۔ وہ قریب ہی گلی میں لگے ہوئے سرکاری نل سے اپنے ابّا کے حقّے میں پانی بھر لائی کہ اس کے ابّا کے آنے کا وقت ہوا چاہتا تھا اور گھر کے اندر والے نل سے امّی برتن مانجھ رہی تھی۔ اسی وقت رحمان جُو گلی میں داخل ہوا۔ نسیمؔ صحن پار کر کے گھر کے اندر جانے والی تھی۔ صحن میں بید اور سفیدے کی چیری ہوئی لکڑیاں چار چار کے حساب سے ایک دوسرے کے اوپر سیدھی اور آڑی رکھی ہوئی تھیں، تاکہ دھوپ اور ہوا ان میں سے گزرے اور وہ جلد سوکھ کر چولھے اور بخاری میں جلنے کے قابل ہوجائیں۔ رحمان جُو نے اوپر سے ایک بڑی سی لکڑی اٹھائی اور جو حال اس دن نسیمؔ کا ہوا سو ہوا اس کی بے چاری امی کو بھی نہ بخشا گیا۔ اس کی ماں غریب کتنے ہی دن اپنے دونوں شانوں پر، جن میں خون جم جانے سے نیلے نیلے دھبے پڑ گئے تھے، جونکوں والے سے جونکیں لگواتی رہی کہ جونکیں وہ گندہ سیاہی مائل خون چوس لیں اور اسے کچھ راحت نصیب ہو۔ اتنے دن نسیمؔ سسکتی رہی اور رحمان جُو اپنی بیوی کے لاجوردی شانوں کو دیکھ کر کھسیانا سا گلی میں بے قرار گھوما کیا۔

ان پردہ نشینوں کو صرف اتنی ہی اجازت تھی کہ اگر کہیں قریب ہی میں آتش زنی کی واردات ہوجائے یا زلزلہ آجائے تو صرف اس صورت میں سب مکینوں کے ساتھ ساتھ یہ لوگ بھی ہمارے گھر کے پائیں باغ میں، جس طرف پیڑ بہت ہی کم تھے، جمع ہوجائیں، ورنہ اور کوئی صورت نہ تھی ان کے گھر سے باہر آنے کی، اس دن تک جب کوئی گھوڑی چڑھ دلہا بن آئے اور اسے ڈولی میں بٹھا اپنی پناہ میں لے لے۔ پھر کوئی پردہ نہ تھا اور اگر تھا بھی، بس برائے نام۔

میں نے گھر آکر آپا کی گھڑکیوں کا سامنا کیا کہ اتنی دیر میں کہاں مر گئی تھی اور اس کے بعد

آپا کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔ بے چاری آپا حیران و پریشان کہ اچانک یہ کیا ہوگیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد وہ خود ہی سمجھ گئیں۔

اب آپا زیادہ تر میرے ساتھ ہی کھیلتیں۔ شکر ہے اللہ نے میری دعا قبول نہ کی ورنہ ادھر شریفہ بی کا پردہ ہوجاتا اور ادھر آپا بی اللہ کو پیاری ہوجاتیں، تو میں کھیلتی کس کے ساتھ۔

میں آٹھویں درجہ میں آگئی تھی اور آپا میٹرک میں۔ ایک دن وہ گونگا فن کار ہمارے ہاں آیا۔ میں نے غور سے دیکھا جب پہچانا، اس کی عمر بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ نہایت پر وقار اور سنجیدہ لگ رہا تھا۔ لیکن اس کا چہرہ بجھا ہوا اور ویران سا تھا۔ بال جنھیں وہ لکڑی پر کام کرنے کے دوران اپنے ہاتھوں سے تراشی ہوئی لکڑی کی کنگھی سے بار بار سنوارا کرتا تھا۔ بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔

شریفہ کی شادی کا رقعہ لایا تھا اصل میں وہ شریفہ کا بھائی نہیں تھا نہ ان کا نوکر یا اس کے ابا کا شاگرد۔ شریفہ کے ابا تو ایک روایتی انداز کا کام کرتے تھے۔ جیسے چھوٹی موٹی گھریلو استعمال کی چیزیں مثلاً مختلف جسامت کے لکڑی کے چمچے، چاول ماپنے کے پیالے، رنگ برنگی کھڑاؤں، چرخے، بچوں کے کھلونے، ننھے بچوں کو چلنا سکھانے والے واکر، متھنیاں، چکلے بیلنے اور لکڑی کی کنگھیاں وغیرہ۔ مگر اس لڑکے کے ہاتھ میں تو جادو تھا۔ ایک نہایت عمدہ کاریگر بننے والی ہر خوبی موجود تھی۔ شریفہ کے ابا سے اس نے صرف کنگھی بنانی سیکھی تھی۔ اسے لکڑی کے چوکور ٹکڑے میں سے ریتی سے گھسا گھسا کر کنگھی کے دانت تراشنا بہت اچھا لگتا تھا۔ باقی کے کام وہ زیادہ تر اپنی عقل سے کرتا تھا۔ بس ذرا سا کسی دوسرے کاریگر کے کام کی صرف ایک جھلک دیکھ کر۔ وہ ان کے دور کے رشتہ دار کا یتیم لڑکا تھا جو کئی برسوں سے ان ہی کے ہاں رہتا تھا۔

اس دن جانے کیا ہوا کہ شام کو زلزلہ آ ہی گیا۔ مجھے زلزلے سے کبھی ڈر نہیں لگتا تھا۔ الٹا ساری دنیا پالنا بنی ہوئی مجھے اور اچھی لگتی۔ سب لوگ پچھواڑے میں جمع ہو رہے تھے۔ پردہ نشینیں بھاگ کر آرہی تھیں۔ میری نظریں شریفہ کو تلاش کر رہی تھیں، تین چار برس سے میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بھی بھاگتی ہوئی لاحول پڑھتی ہوئی ہمارے ہاں آگئی۔

میں نے اسے دیکھا تو حیران رہ گئی۔ کیا یہ وہی شریفہ تھی۔ ہاں وہی تو تھی۔ مگر کتنی حسین ہو گئی تھی۔
جیسے نور کا ایک ٹکڑا۔ جیسے ماہِ اکتوبر کا گول چاند۔ میں دیدے پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہی تھی۔
بھاگنے میں اس کی چوٹی بل کھا کر سامنے کی
طرف آ گئی تھی۔ لمبے لمبے گھنگھریالے بالوں کی نرم نرم سی گھنی چوٹی۔ لیکن پہلے جیسی کسی ہوئی نہیں،
بلکہ ڈھیلی ڈھالی، شکر ہے اس کی اماں کے چوبی سے پنجے کی پکڑ سے اس کی چٹیا آزاد ہو گئی تھی۔
جبھی تو اس نے خود بڑے سلیقے اور نفاست سے اسے گوندھا تھا۔ جس سے اس کے ماتھے
پر نئے نئے اُگے ہوئے خمدار گیسوؤں اور کنپٹیوں اور کانوں کے پاس سے لہراتی ہوئی کچھ کچھ لمبی
زلفوں نے اس کے مکھڑے کے چاند کے گرد ہالہ سا بنا رکھا تھا۔ اس نے ہرے رنگ کی
ساٹن کا پھرن پہن رکھا تھا۔ جو ہوا کے ہلکے سے جھونکے سے یوں لہرانے لگتا جیسے سبزہ زاروں
سے گھری ہوئی ندی میں ہلکی ہلکی لہریں اٹھ کھڑی ہوں۔ اس کے گریبان پر سنہری رنگ کے
تلے سے بیل بوٹے کڑھے ہوئے تھے۔ سرخ و سپید رنگت، لاجوردی لب،
شہابی رخسار، وہ بادام کے شگوفوں سے لدی ہوئی ایسی ڈالی لگ رہی تھی جس میں نازک ہری
ہری پتیاں بھی اُگی ہوں۔ زلزلہ ذرا تھما تو وہ اور آپا ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ "گونگا اندر
دب کر کہیں مر نہ جائے باہر آ ہی نہیں رہا" اس نے آپا سے تشویش ظاہر کی۔ "گونگا" بے چارے
کا جیسے کوئی نام ہی نہ ہو۔
کچھ دیر بعد سب لوگ چلے گئے۔ عجیب بات ہے وہ اتنے دنوں بعد آپا سے ملی تو صرف
ایک بات کی وہ بھی گونگے کی۔ میں اکثر سوچا کرتی۔
کرتی بھی تو اور کیا بات کرتی۔ جانے کیوں عزیز بٹ نے گونگے کو ہمیشہ نوکر کی طرح
سمجھا۔ اتنا محنتی، ذہین، خوبرو، وہ بے زبان اپنے لیے کسی سے کچھ نہ مانگ سکا۔ اس کی
خاموش گفتگو صرف شریفہ ہی سمجھتی تھی۔ اور وہ بھی کیا خاک سمجھتی تھی۔ وہ تو اس سے بھی زیادہ
گونگی تھی۔
آپا شریفہ کی شادی میں گئیں تو میں بھی ساتھ تھی۔ امی کا حکم تھا کہ دونوں بہنیں ساتھ رہیں
اور مجھے خاص ہدایت تھی کہ میں آپا کو اکیلا نہ چھوڑوں۔ اور میں آپا کو اکیلا نہ چھوڑنے میں اور بھی

خوش تھی۔ ساتھ چپکی رہوں گی۔ سب باتیں سنوں گی ان دونوں کی۔ ڈانٹ بھی تو نہ سکیں گی۔ مزا آئے گا اور خوب آیا بھی ــ جب وہ شریفہ سے بات کرتیں : تو میں اور بھی قریب آجاتی بلکہ درمیان میں گھس جاتی۔ آپا کے چہرے پر صاف ناگواری کے تاثرات دیکھ کر میں ہنسی دبانے کے لیے ہونٹوں کو اِدھر اُدھر موڑنے توڑنے لگتی جیسے میری ناک میں کھجلی ہو رہی ہو۔ کتنا مزہ آرہا تھا دونوں کے درمیان گھس کر بیٹھنے میں۔ شریفہ کے پاس سے مہندی کی دلفریب مہک آتی۔ ذرا سا سر ہلانے سے اس کے لمبے لمبے جھمکے اور بڑی بڑی کنواجیاں جھومنے لگتیں، چوڑیاں کھنک جاتیں۔ ہمارے ہاں شادیوں میں دو ہی تو دلچسپیاں ہوتی ہیں۔ ایک دلہن دوسرا وازوان۔ ایسے عمدہ پکوان کی روایت اور کہیں نہیں ہے۔ تقریباً ۳۶ طریقوں سے پکایا ہوا گوشت۔ سارا دن ان کے گھر سے، لکڑی کے ہتھوڑے سے پتھر کی سل پر گوشت کوٹنے کی آوازیں آتی رہی تھیں۔ اور میں سب سے آخری پکوان "گشتابہ" کی منتظر تھی۔ شریفہ کو گونگے کی فکر تھی آپا اسے تسلی دیتی جا رہی تھیں۔ یوں تو وہ اللہ میاں کی گائے ہی تھی۔ جس کھونٹی سے باندھی، بندھ گئی، چپ چاپ۔

میں ان کی وہ باتیں بھی سن لیتی جو بقول ان کے میرے سننے کی نہ تھیں۔ مثلاً یہ کہ شریفہ کا دولہا بہت قسمت والا ہے۔ شریفہ نے بتایا عزیز بٹ کا سگا بھانجہ تھا وہ۔ اس کی مرحوم بہن کی اکلوتی نشانی۔ عمر ذرا زیادہ تھی۔ تو کیا ہوا، تھا تو قسمت والا۔ عزیز بٹ نے سارے گھر کو بتلایا تھا۔ جب گُلے کی قسمت کھُلے گی تو سارے خاندان والے دنگ رہ جائیں گے۔ آخر اس کے ہاتھ کی چھ انگلیاں، کوئی مذاق تھا؟ چار انگلیاں دو انگوٹھے۔ بڑے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے درمیان ایک چھوٹا سا انگوٹھا جو اکثر ہلتا رہتا۔ اِدھر گُلے نے کوئی کام کرنے کو ہاتھ ہلایا اُدھر بیچ میں اگا ہوا یہ انگوٹھا۔ گھڑی کے پنڈولم کی طرح ہلنے لگا۔ ہاتھ رک گیا، انگوٹھا بدستور ہل رہا ہے جیسے کسی بڑھیا کے کان میں کوئی پُرانا بُندا۔ ابھی تک گُلہ اپنے لکڑی کے کام میں جم نہیں پایا تھا۔ جب اس کی قسمت ظہور پذیر ہوگی تو روپے کی ریل پیل ہوگی اور شریفہ عیش کرے گی۔ عزیز بٹ کہا کرتے۔

بے چاری شریفہ کیا عیش کرتی یہ تو میں دولہا دیکھ کر ہی جان گئی تھی۔ پری جیسی دُلہن۔ اس

کے قرمزی رخساروں پر لگاتار آنسو رواں تھے جیسے کنول کی پتیوں پر جھیل کے پانی کی لہروں میں سے ٹھہرے ہوئے کچھ قطرے۔ وقفے وقفے کے بعد کوئی خاتون آتی اور دُلہن کے سامنے رکھی ہوئی کانگڑی میں اسپند کے دانے ڈال جاتی، ایسے میں میں کانگڑی کے ساتھ بندھی 'ژالن' سے آگ کو ہلاتی اور دانے آگ سے چھوتے ہی چٹ چٹ کر ساری فضا میں خوشبو بکھیر دیتے۔ دلہنوں کی کانگڑیاں بھی تو دلہنوں سی سجی سجائی بنائی جاتی ہیں۔ خاص طور سے کانگڑی کے چاروں طرف بید کی پتلی پتلی چھوٹی ٹہنیوں کو موڑ کر بنائے گئے ننھے ننھے دائرے آویزاں تھے۔ جن پر باری باری سبز اور سُرخ رنگ کیا گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی حسینہ کے کانوں میں رنگ برنگی بالیاں۔ کانگڑی کے بیچ میں لگے مٹی کے پیالے اور ایک مخصوص جھاڑی کی نازک شاخوں سے بُنی گئی جالی کے درمیان، چمکیلا، سرخ اور سبز رنگ کا کاغذ بڑی نفاست سے پھنسا ہوا تھا۔ دور سے کانگڑی کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے کوئی جاپانی گڑیا فرش پر سجا رکھی ہو۔ سارے میں خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ کانوں میں، شادیوں میں گائے جانے والے مخصوص گیت "وَن وون" کی آوازیں آرہی تھیں۔

جانے عورتیں ہر خوشی کے موقعے میں سے رونے کا بہانہ کیوں نکال لیتی ہیں۔ اگر دُلہن کے ماں باپ نہیں ہیں تو اس بات پر شعر تراش کر گائے اور گوائے جاتے ہیں۔ اگر ماں باپ ہیں، اور نانی یا دادی حیات نہیں تو ان کو یاد کر کر کے رویا اور گایا جاتا ہے۔ اگر خدا نے بھائی نہیں دیا تو اس دکھ کو دہرا دہرا کر گایا جاتا ہے کہ دلہن تو کیا، سب سننے والے رو پڑیں یوں بھی شاید ہم مشرقی لوگ رونے کے بہانے تلاش کرتے رہتے ہیں اور پھر دُلہن کی رخصتی کے گیت تو ہوتے ہی پُرسوز ہیں۔

زبان کوئی بھی ہو، ہماری بیبیاں دُلہن کو رُلائیں گی ضرور، تو ادھر بے چاری شریفہ کیسے بچتی۔ رات کے سناٹے میں بیبیاں پُردرد سُروں میں "ون وون" الاپ رہی تھیں ـــــ

مانیخ کونزہ کر دیدۂ حوالئے
نیرہِ کوری وٗ اُرو یکہ سوالئے
(مائیکے کی چابیاں ماں کے حوالے کردے بٹیا کہ جا اب تجھے سسرال جانا ہے)

وہ غریب "ون وون" کے دل سوز گیتوں سے دھیان ہٹانے کی کوشش کرتی، تو سامنے سے گونگا ہاتھ میں بڑا قلعی کیا ہوا تانبے کا بھاری چمکتا ہوا لوٹا اور بہت بھاری بڑی سی طشت لیے مہمانوں کے ہاتھ دھلاتا، دسترخوان سمیٹتا نظر آتا۔ کھویا کھویا سا سجے سنورے مہمانوں کے درمیان اجڑا اجڑا سا۔

بے زبان، وہ اور اداس ہو جاتی۔ کون خیال رکھے گا اس کا۔ وہی تو سب کا خیال رکھتی تھی۔ ابّا بھی بوڑھے ہو چکے ہیں اور بے چاری ماں۔ کیسے سب لوگ اس کی جدائی سہہ پائیں گے۔

اور یہ دولہے میاں —— "حور کے پہلو میں لنگور خدا کی قدرت"

وقت گزرتا گیا، کچھ عرصہ بعد — عزیز بٹ انتقال کر گئے۔ حور بھی شادی کی عمر کو پہنچ چکی تھی۔ گونگے نے اپنے آپ کو کام میں غرق کر دیا تھا۔ ادھر شریفہ بی بڑی تندہی سے پھولنے، پھیلنے، پھلنے اور سمٹنے میں مشغول تھی۔ اور نصیبوں والے گلّہ میاں نہایت سست رفتاری سے زندگی کی جانب رینگ رہے تھے۔ انھیں صرف اپنی قسمت کھلنے کا انتظار تھا۔ وہ اپنے خوش نصیب انگوٹھے والے ہاتھوں کا بہت کم استعمال کرتے۔ مغرب کی نماز سے بھی پہلے گھر لوٹ آتے اور بوسیدہ سے تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز گھنٹوں مٹی کا حقّہ گڑگڑاتے۔ تانبے کا حقّہ تو کب کا بک چکا تھا اور بعد میں سرِ شام ہی پانی جیسے شوربے کے ساتھ جس میں ہاک ساگ کے چند پتّے تیرتے ہوئے نظر آتے۔ ڈھیر سارے چاول کھاتے اور پھر بیوی کو عجیب عجیب نظروں سے تاکتے۔

اور بے چاری شریفہ کی تقدیر شریفے کی ہی طرح نکلی۔ میٹھا پھل تو برائے نام اور بیج لاتعداد۔ عرصے بعد ایک دن میں نے گلی سے گزرتے ہوئے اسے دیکھا۔ مائیکے کے چھوٹے سے آنگن میں تھکی تھکی بیٹھی تھی۔ ماں سے ملنے آئی تھی۔ سرخ رنگت تو جیسے کبھی تھی ہی نہیں اس کی۔ ایک دم سفید تھی وہ، اور اتنی دبلی ہو گئی تھی کہ اس کے گداز شانے ایک آڑھی تختی کی طرح لگ رہے تھے۔ اس کا پھولوں کی ٹوکریوں جیسا سینہ بکری کے تھنوں جیسا ہو گیا تھا اور اس کا پانچواں بچہ گردن اونچی کیے اُس کا سینہ چچوڑ رہا تھا۔

اس نے مجھ سے سب کا حال پوچھا۔ اسے کسی طرح پریشانی یا بدحالی کا احساس نہ تھا۔

وہ اپنی زندگی سے مطمئن تھی۔ وہ بیوقوفی کی حد تک بھولی تھی۔ حور اس کے پاس ہی بیٹھی تھی اور ایک ننھا سا خوش پوش بچہ، جو ہو بہو گونگے کی شکل کا تھا۔ شریفہ کے بچّوں کے درمیان گھرا ہوا کھیل رہا تھا۔

کچھ پل کے لیے تو میں دونوں بہنوں کو پہچان نہ سکی۔ کہاں وہ پریوں کا سا حسن اور کہاں یہ بانس کی سی دبلی پتلی سوکھی سڑی سی عورت اور حور — وہ تو بالکل ہی بدل گئی تھی۔ اس کے چھدرے بال خوب گھنے ہو گئے تھے۔ اور رخسار بھرے بھرے ہو جانے سے اس کی ناک بھی موزوں لگنے لگی تھی۔ بھرے بھرے گول چہرے میں سے دانت بالکل بھی باہر کو نہ لگتے تھے۔ اس کی آنکھوں میں زندگی کی ہر آسودگی کی چمک تھی اور دیدہ زیب لباس میں وہ آج ، سچ مچ کی حور نظر آ رہی تھی۔

گونگے کے ہاتھوں کو اللہ نے بولنے اور سننے دونوں کی طاقت عطا کی تھی۔ اس کے ہاتھ لکڑی کے اس حصّے کی آواز سن لیتے جو اپنے اندر بولتے ہوئے نقش سمیٹے ہوتا اور اس کی انگلیاں ان نقوش کو سنوار اور نکھار کر ایسی زبان دے دیتیں کہ ہر نقش اپنی تعریف اپنے آپ کرنے لگتا۔ اس کے ہاتھ ٹھونک بجا کر محسوس کر لیتے کہ لکڑی کیسی ہے۔ نرم ہے یا سخت، کہیں اس میں گانٹھ تو نہیں ہے کہ بعد میں بنائی ہوئی چیز میں سے چھوٹے چھوٹے دائروں کی شکل میں نکلنے لگے۔ اسے سونگھ کر پتہ چل جاتا کہ لکڑی سوکھی ہے یا نہیں۔ کہیں اندر کہیں سے گیلی تو نہیں کہ بنانے کے بعد چٹخ جائے۔ اس کی ہر تخلیق لاجواب ہوتی — وہ کچھ بھی بناتا ، مثلاً ٹیبل لیمپ، سنگھار میز، مسہری، صوفے، الماریاں، محرابیں، در، دیواریں، کھڑکیاں، دریچے، جالیاں، طاقچے، گھر، ہاؤس بوٹ اس کا فن بے مثال تھا۔ کچھ بھی تراشتا، اس کا ہاتھ چھو جانے سے ان تخلیقات میں جان پڑ جاتی۔

شریفہ کی ماں نے حور کا نکاح گونگے سے کر دیا تھا اور اچھا ہی تو کیا تھا اس نے۔ کچھ سوچ کر ہی اُس نے حُور کا نام حُور رکھا تھا۔ نہایت موزوں۔ اسم بامسمیٰ۔

○○

چھوئی موئی

میرے سامنے میٹھے پانی کا چشمہ تھا۔ پانی سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اور یہ پانی اس قدر شفاف تھا کہ تہہ میں اگی ننھی ننھی گھاس کے پودے، چھوٹے چھوٹے گول پتھر اور کنکر بالکل صاف نظر آتے تھے۔ خوبصورت چھوٹے سے فوارے کی شکل میں چشمہ پھوٹتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ چشمہ دائرہ نما تھا۔ اور ایک کنارے سے باہر کو ننھی سی ندی کی شکل میں بہہ رہا تھا۔ اس کے گرد ہری ہری گھاس اُگی ہوئی تھی۔ اس کا پانی گنگنا تھا۔ چشموں کا پانی سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں ٹھنڈا ہوا کرتا ہے۔ قدرت کی شان ہے ورنہ ان وادیوں اور پہاڑوں میں پانی کیسے گرم کیا جاتا۔

مینڈک ہماری موجودگی کے باوجود بڑی آزادی سے چشمے کے اندر باہر آجا رہے تھے۔ جب میں اپنا پاؤں کنارے پر پٹختا تو کناروں پر اُگی گھاس میں سے مینڈک ایک ہی جست میں چشمے کے اندر یوں کود پڑتے جیسے دوڑ میں حصہ لینے والے کھلاڑی سیٹی کی آواز سُن کر ایک ساتھ بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور —— وہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتی اور —— میں اس کی موتی کی لڑیوں ایسے دانتوں کو، اس کی معصوم ہنسی کو دیکھتا رہ جاتا۔ مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ شرم سے سرخ ہو جاتی۔ ایک تو اس کا رنگ ہی گلابی تھا۔ اوپر سے سردی۔

اس کی ناک اور رخسار شہابی ہو جاتے اور لب لاجوردی۔ اس کی مجوب آنکھوں پر پلکوں کی جھالریں تتلی کے پروں کی طرح پھڑپھڑاتیں اور جھک جاتیں۔ پھولوں کی ڈالیوں ایسے ہاتھوں

سے وہ چہرہ ڈھک لیتی اور ایسا کرنے سے اس کے گلے میں پڑی مہین مہین موتیوں کی مالائیں، ہلکا سا نغمہ چھیڑ دیتیں۔ اور گردن جھکانے سے اس کے سر پر گندھی لاتعداد باریک باریک مینڈھیاں اس کے عارضوں کو چھونے لگتیں۔ وہ اپنا ایک پاؤں، دوسرے پاؤں پر رکھ کر اور سمٹ کر بیٹھ جاتی اور میں حسن، حیا اور پاکیزگی کی اس مکمل مورت کو دیکھ دیکھ کر اپنی قسمت پر ناز کرنے لگتا۔ میری روح تک میری خوشی اتر جاتی۔

اس خوشی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اس قدر معصوم اور بھولی تھی کہ اسے معلوم ہی نہ تھا کہ قدرت نے اسے بے پناہ حسن دیا ہے۔ چاند سے زیادہ۔ گلاب سے بڑھ کر۔ کنول کے شبنم آلود پتوں سے زیادہ، بہت زیادہ بہت ہی زیادہ۔ اتنی بھولی، اتنی سادہ، اتنی سیدھی کہ شاید ہی اس نے کبھی محبت کا نام سنا ہو، کوئی داستانِ محبت سننے کا تو سوال ہی نہیں۔ مگر کیا امی یہ سب مانیں گی۔ کیا میری پسند ان کی نظروں میں بھی اتنی ہی اہم ہوگی جتنی کہ میرے نزدیک۔ اس خیال سے میری دھڑکن رکنے لگتی اور میں خود کو کچھ اور سوچنے پر مجبور کرتا۔

کچھ مہینے پہلے جب میں سات سال بعد وطن لوٹا تو امی ہوائی اڈے پر میری منتظر تھیں۔ اور ان کے ساتھ عفت بھی تھی۔ میری پھوپھی زاد بہن۔ خوبصورت بجی سنوری، سلیقے سے تراشے ہوئے بال۔ ہلکا سا میک اپ۔ ہاتھوں میں بہت سے پھول لیے اس نے میرا استقبال کیا اور ہم گاڑی میں بیٹھ گئے۔ وہ گاڑی چلا رہی تھی۔ اس کے پاس سے "کوبرا" کی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ امی پیچھے بیٹھی تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ امی اسے میری دلہن بنانا چاہتی ہیں۔

میں نے یورپ میں عورت کی جو شکل دیکھی تھی مجھے کسی طرح نہ بھائی تھی اور یہاں بھی وہی مصنوعی مہک، بیوٹی پارلرس کے سانچوں میں ڈھلی جبراً خمیدہ زلفیں۔ ویسے ہی ملبوسات۔ ویسا ہی میک اپ۔ تو پھر میری پسند کی ساتھی مجھے کیسے ملے گی۔ مگر مجھے کہیں کسی بھی ماحول میں ایک بھی لڑکی ایسی نہ نظر آئی جو میری پسند کے مطابق ہو۔ جو میرے ذہن کی کسوٹی پر پوری اترتی۔

امی عفت کی بہت تعریفیں کیا کرتیں۔ جب میں انجینئرنگ کے بعد یورپ چلا گیا تو وہ

ایم۔ بی۔ بی۔ ایس (M.B.B.S.) میں آگئی تھی۔ آج وہ ایک قابل، جیسا امی کہتیں، ڈاکٹر تھی۔ موڈرن، سنجیدہ۔ یعنی بقول امی کے ایک اچھی لڑکی۔ پرانے تجربات نئے رشتوں کو مضبوط کرنا چاہتے تھے۔ اور ایسا ہونا ممکن بھی تھا کسی حد تک، اگر وقت یوں ہی گزرتا رہتا۔ اگر میں نے اسے اپنے ساتھی ڈاکٹر کے ساتھ بیباکانہ، انسانی جین (GENE) کے منتقل ہونے پر گفتگو کرتے ہوئے نہ سنا ہوتا جبکہ اس کے چہرے پر اس وقت کوئی تاثر بھی نہ تھا شرم و حیا کا۔ اور اگر میں امی کے کہنے سے گاؤں نہ گیا ہوتا جہاں ہماری زمینوں کی حدود کو چھوتی ہوئی حسین وادی ناگامرگ کے اس حصے کی پیمائش کرنا تھی جو حکومت ہم سے خریدنا چاہتی تھی۔ جہاں سے ایک سڑک نکالنا مقصود تھی، جو آگے جاکر بانڈی پور کے پہاڑی سلسلے سے ملنا تھی۔ اور ناگامرگ کی یہ وادی جو گلمرگ سے بھی حسین تھی سیاحوں کی مصروف ترین آماجگاہ بن جاتی۔ ابھی تو وہاں ڈاک بنگلہ تک نہ تھا کہ وہ اس قدر اونچائی پر تھی۔ مگر ایک بار جو وہاں سے سڑک نکلے گی تو پھر وہاں گیسٹ ہاؤس، فائیو اسٹار ہوٹلز، سب کچھ تعمیر ہو سکتا تھا۔ اور اس کے لیے ہم حکومت سے منہ مانگی قیمت وصول کر سکتے۔ مگر یہاں تو میں نے وہ انمول شے پالی تھی جس کی کائنات بھر میں کوئی قیمت نہ تھی۔

میں گھوڑی پر سوار اس وسیع و عریض حصے کی نشاندہی کروا رہا تھا کہ گھومتے ہوئے جانے کس طرف کو نکل آیا۔ ایک چوڑا سا کچا راستہ اوپر ہی اوپر کو چلا جا رہا تھا۔ سوچا کہ ذرا دیکھ آؤں پہاڑی کہاں ختم ہوتی ہے کہ گھوڑی تو میرے پاس تھی ہی اور جب چاہے اسے ایڑھ لگا کر واپس دوڑا لاتا۔ کم از کم میں ڈھلان تک تو بہر صورت جانا چاہتا تھا۔

اس قدر اونچائی تک میں پہلے کبھی نہ آیا تھا۔ فطرت کو اتنا قریب سے میں نے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ ہر سو دیودار اور چیڑ کے اونچے درخت، خوش رنگ خودرو پھولوں کی بے شمار قسمیں، بیسیوں قسم کے پرندے۔ کچھ موسمی، کچھ مستقل رہنے والے۔ ساری فضا عجیب سی روح پرور خوشبو سے مہک رہی تھی۔ جس میں پھولوں کی خوشبو بھی شامل تھی، جنگلی گھاس کی بھی اور ان جنگلی درختوں کے تنکے نما نوکیلے پتوں کی بھی۔ اتنا سکون، اتنی خاموشی۔ جنت کے سے اس منظر اور سکون کو کبھی کسی پپیہے، کسی فاختہ، کسی جنگلی بلبل، کسی ہدہد، طوطے، گلپچیاں، مینا، سرخاب،

ابابیل، یا جنگلی کوئل کی چہچہاہٹ ایک شیریں سریلے نغمے میں بدل دیتی۔ میرا دل واپس لوٹنے کو نہ چاہا حالانکہ میں بنا منزل کا کوئی نشان پائے اب تک چلا جا رہا تھا۔ جانے کب یہ چوڑا، کچا راستہ ایک تنگ پگڈنڈی کی طرف مڑ گیا۔ مجھے یہ خیال ہی نہ آیا کہ راستہ کہیں اور بھی جا سکتا ہے۔ جانے کتنی دور تک یوں ہی میں بڑھتا چلا جاتا رہا تھا مجھے پیاس بھی لگ رہی تھی۔ گھوڑی کے منہ سے مارے پیاس کے جھاگ نکل رہی تھی۔ اور اس وادی میں ایسا تو ممکن ہی نہ تھا کہ پانی نہ ملے۔ اتنی اونچائی پر ہی سہی مگر پانی ہوگا ضرور کہ یہ وادی تو تھی ہی چشموں کی وادی۔"وادیٔ لولاب"

— لولہ، آب یعنی محبت کے پانیوں کی وادی   تو شاعر نے کہا ہے ؎

پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب

اے وادیٔ لولاب

یہاں تو ایک سے ایک میٹھے پانی کا چشمہ تھا۔ چشمہ تلاش کرنا کوئی مشکل کام تو نہ تھا۔ مگر اس سونے جنگل میں اتنی اونچائی پر جہاں کسی انسان کا نام و نشان تک نظر نہ آ رہا تھا، کہاں پانی ڈھونڈتا میں۔ خیر میں نے ہمت نہ ہاری، نہ ہی واپس لوٹا۔ کچھ اور آگے بڑھا تو مجھے اخروٹ کے ایک بڑے سے درخت کی شاخیں نظر آئیں۔ یعنی آس پاس کوئی رہتا تھا۔ اب پگڈنڈی آگے ایک چھوٹی سی ڈھلان سے ہو کر ایک میدان میں ختم ہوتی تھی۔ اخروٹ کا درخت ایک بوڑھے چنار جتنا بڑا تھا اور اس کی لمبی لمبی شاخوں نے باہیں پھیلا کر میدان کے ایک کشادہ حصے کو اپنے سائے میں لے لیا تھا۔ میدان میں ایک چشمہ بھی تھا جس کا پانی دھوپ میں مچلتے ہوئے پارے کی طرح لگ رہا تھا۔ دوسری طرف ایک چھوٹا سا گھر بھی تھا ٹیڑھے میڑھے چھوٹے بڑے ناتراشیدہ پتھروں اور گارے سے بنا ہوا۔ جس کی چھت پر دیودار کی کڑیاں لگی ہوئی تھیں۔

میں اخروٹ کے پیڑ سے کچھ دوری پر گھوڑی سے اتر آیا پیڑ کے تنے کے قریب ایک لڑکی سر نیوڑھائے، نوکیلے سے ایک پتھر سے اخروٹ کے پیڑ کی ابھری ہوئی جڑ کو چھیل کر داتن نکال رہی تھی، وہ آہٹ پا کر کھڑی ہو گئی اور مجھے ایسے دیکھنے لگی جیسے پہلی بار انسان کو دیکھ رہی ہو۔ میں بھی اسے ایسے ہی دیکھنے لگا۔ میں نے بھی آج سے پہلے ایسی کوئی صورت نہ دیکھی تھی

جسے دیکھ کر میں آنکھ جھپکنا بھول گیا۔ اس کی عمر کوئی ۱۸ یا ۱۹ برس ہوگی۔ اس نے سیاہ رنگ کی پیر ہنی (جو گول گھیرے کی فراک کی طرح کا چغہ نما لباس ہوتا ہے مگر جو فرن سے مختلف ہوتا ہے) پہن رکھی تھی۔ تنگ پائنچوں کی شلوار کا رنگ بھی سیاہ تھا۔ پائنچوں میں سے اس کے سفید پاؤں دو جنگلی کبوتروں کی طرح جھانک رہے تھے۔ اس نے سر پر لچکا پہن رکھا تھا۔ جو سامنے سے تو ٹوپی کی طرح ہوتا ہے مگر گردن کے پاس اس کے ساتھ ایک پٹی سی جوڑی گئی ہوتی ہے جو آدھی گردن کو ڈھک لیتی ہے۔ لچکے کے اوپر اس نے چھینٹ کی بڑی سی چھپیری (اوڑھنی) اوڑھی ہوئی تھی۔ اخروٹ کی جڑ کی چھال دانتوں پر رگڑنے سے اس کے لب عنابی ہو گئے تھے۔ دودھ سا سفید چہرہ اور رخساروں کے ابھار گلابی، حیران بھولی آنکھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کر جیسا کہ مجھے محسوس ہوا اپنے گھر کی طرف جاتی میں جلدی سے بولا۔

"میری گھوڑی پیاسی ہے۔" مجھے اس کی پہاڑی زبان تو نہ آتی تھی مگر وہ میری زبان کسی حد تک سمجھ گئی۔

"آ" وہ بولی۔

میں نے گھوڑی کی باگ تھامی اور اس کے پیچھے چل پڑا۔ پہلے میں نے اور پھر میری گھوڑی نے ایک ہی چشمے سے پانی پیا۔

"تم یہیں رہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔ اس نے سر ہلا کر اس طرف اشارہ کیا جہاں بر اس کا چھوٹا سا گھر تھا۔ جس کی چھت پر بہت سے ٹماٹر اور بینگن کاٹ کر سوکھنے کے لیے بچھائے گئے تھے اور چھت کے بیچوں بیچ ایک بڑے سے سوراخ میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ گھر کے دو طرف مکئی اگی ہوئی تھی اور تیسری طرف سبزیوں کا چھوٹا سا باغیچہ تھا جہاں دیوار کے ساتھ ساتھ لوکی، کدو وغیرہ بوئے گئے تھے اور ان کی بیلیں اٹھ کر پوری دیوار اور آدھی چھت ڈھکے دے رہی تھیں۔ کہیں کہیں کھیرے اور لوکیاں لٹکتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ گھر کے اندر ایک طرف کو مویشی رہتے تھے اور دوسری طرف اس کا سارا کنبہ۔

"تمھارا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"زیتونہ" میں نے پہلی بار اس کی آواز ٹھیک سے سنی۔ اسی کی طرح معصوم۔

گرمیوں میں وہ لوگ اسی طرح مویشیوں سمیت پہاڑیوں پر عارضی قیام کے لیے آجاتے۔ اتنی اونچائی پر کہ گرمیوں کا موسم بہار میں بدل جائے اور یہ لوگ فطرت کی گود میں یوں پلتے جیسے ماں کی گود میں بچے۔

پھر —— میں اکثر اپنے آپ کو ان پہاڑوں پر دیکھنے لگا۔

اور تب سے ایک موسم بدل گیا۔ اب سردیاں تھیں۔ وہ لوگ نیچے گاؤں اتر آئے تھے۔ ہماری شناسائی کئی مہینے پرانی ہوگئی تھی۔ جتنا میں اسے جانتا چلا گیا اتنا ہی وہ میرے معیار پر کھری اترتی گئی۔ اب مجھے یہ فیصلہ لینے میں ذرا جھجک نہ ہوتی کہ میں اسے زندگی میں وہ مقام دے دوں جو صرف اور صرف اسی کو دینے لائق تھا۔ ہاں، وہی تو تھی اس قابل۔ معصوم سی، پھولوں سی نازک، الھڑ، دوج کے چاند ایسی، اچھوتی، چھوئی موئی۔ جس کو یہ بھی پتہ نہ تھا کہ محبت ہوتی کیا ہے۔ کیوں ہو جاتی ہے۔ وہ حیران آنکھوں سے ایسے تکا کرتی جیسے پوچھ رہی ہو کہ کون ہو تم میرے۔ اور میں بھی اسے زبانِ خاموش سے یہ سمجھاتا کہ تم میری اپنی ہو۔ کوئی ایسی اپنی جو زندگی میں صرف ایک بار اپنائی جاتی ہے۔ اور جس سے بڑھ کر کوئی اور نہیں ہوتا دنیا میں۔

ہم ایک دوسرے کی زبان کم ہی سمجھتے یا بولتے تھے۔ اس لیے گفتگو کم ہی ہوا کرتی۔ ہم ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دیودار کے پیڑوں کے اندر کہیں دور نکل جاتے۔ بندروں کو اچھلتا کودتا دیکھتے۔ پیڑوں سے رسنے والی گوند کو چیونگ گم کی طرح چباتے ہوئے، ہنستے ہوئے وقت گزار دیتے۔ صبح سے دوپہر ہو جاتی اور کبھی دوپہر سے شام۔

اسے پاکر مجھے صرف اسے پالینے کی تمنا رہ گئی تھی اور کوئی لگاؤ نہ رہا تھا کسی شے کے ساتھ مجھ کو۔ شکر ہے مجھے وہ مل گئی تھی ورنہ —— میں حقارت سے سوچتا "عفت" نام تو عفت تھا مگر .....

مجھے امّی کی عقل پر افسوس ہوتا۔ امّی کو میری پسند پر لبیک کہنا ہی پڑے گا۔ آخر زیتون میں کمی ہی کس بات کی تھی۔ حسین و جمیل، پاکیزہ، عفت کی طرح کسی مرد سے بحث تو کجا (وہ بھی GENE ایسے موضوعات پر) اس نے نظر تک اٹھا کر نہ دیکھا تھا کسی کو میرے سوا۔ یہ بات اتنی

ہی اٹل تھی جتنا یہ کہ وہ میرے پاس گاؤں کے اس میٹھے شفاف پانی کے چشمے کے کنارے بیٹھی دو ہاتھوں سے چہرہ ڈھکے اپنی مخروطی انگلیوں کی درازوں سے مجھے کسی معصوم بچے کی طرح چوری چوری دیکھتی ہوئی۔

میں نے اس کے ہاتھ اس کے چہرے سے ہٹا لیے اور بولا۔

"میں تمھیں شہر لے جاؤں گا، اپنے ساتھ۔ بس اب جاکر امی سے اجازت لے لوں گا۔ اور تمھیں اپنی دلہن بنا کر لے جاؤں گا۔ کب سے گھر نہیں گیا۔ اب تو امی کو میرے خطوط کی شکل دیکھ کر غصہ آتا ہوگا۔"

"نہیں۔" وہ بولی۔

"کیوں؟ کیا تمھیں مجھ پر بھروسہ نہیں؟" میں نے کہا۔

"اس نے بھی ایسا بولا تھا۔" وہ کھوئے ہوئے انداز میں بولی۔

"کس نے؟" میں حیرت، بے یقینی اور بے چینی کے سے عالم میں بڑبڑایا۔

"او ڈریول تھا۔ بڑی گاڑی چلاتا تھا۔ پچھلے سال ادھر ملتا تھا۔" وہ کچھ دیر کو رُکی پھر بولی۔

"بابا بہت مارا تھا مجھ کو۔ اماں نے کتنی کڑوی جڑی کھلائی تھی۔ بہت سی جڑی کھلائی۔ بہت مارا۔"

مجھے پتہ ہی نہ چلا میں کب اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی باتیں سنتا ہوا، الٹے قدم اٹھاتا ہوا — جیسے میں خود کو اس سے دور کھینچ رہا تھا۔ بہت دور اور بہت جلد۔

"نہیں — نہیں نہیں۔" میں تقریباً چیخ پڑا۔

ماں نے مجھے اتنے مہینے بعد دیکھا تو پیشانی چوم لی۔ عفت اس وقت ہمارے ہاں ہی تھی۔ چائے بنا لائی۔ اور میں بعد مدت کے اپنے گھر میں تھا پُرسکون۔ میں رنجیدہ نہیں تھا۔ میں کیا کرنے جا رہا تھا۔

میں بر وقت ہی جان گیا۔

میری مجروح سوچیں بے لگام جانے کدھر کو دوڑتی چلی جا رہی تھیں کہ اچانک مجھے خیال آیا

— وہ بھولی ہی تو تھی جو اس نے اس کے بھول پن سے فائدہ اٹھایا — نہیں — بھولی کہہ کر
میں اس کی اتنی بڑی غلطی کی شدت کو کم نہیں کرنا چاہتا تھا۔
مگر شاید اس کی خطا بھی نہیں تھی۔
وہ ایسی مظلوم لڑکی تھی جسے خود پر ہوئے ظلم کا نہ احساس تھا نہ رنج۔ اسے غم تھا تو فقط
وہ رنج جھیلنے کا۔ مگر — میں نادان نہیں ہوں؟ وہ لاکھ معصوم و مظلوم سہی، ———

تو یہ تھا اس سادہ حسن کا دوسرا رُخ ———
اُف یہ کیا ہو جاتا ———
میں نے سر تھام لیا۔
عفت نے میری نبض دیکھی۔ مجھے دوا کی ٹکیا کھلا دی۔
گرم پانی سے غسل کر کے آرام کرنے کا مشورہ دیا اور اپنی کچھ کتابیں اور تقریباً تین کلو وزنی
تحقیقی مقالہ جو GENE پر لکھا گیا تھا، ہاتھ میں لے کر امی سے جانے کی اجازت طلب کی۔
" ارے بیٹھیے نا — کہاں جا رہی ہیں" میں نے پہلی بار اسے براہ راست
مخاطب کیا۔
" کچھ کام باقی ہے۔ تھیسز داخل کرنے میں بہت کم وقت رہ گیا ہے" اس نے
سپاٹ لہجے میں کہا۔
" اچھا جاتے جاتے ایک اور کپ چائے تو پلاتی جائیں" میں نے کہا
" ٹھیک ہے ابھی لاتی ہوں"
وہ چائے بنانے گئی تو میں اس کی کتابوں کو یوں ہی دیکھنے لگا۔ علمِ طب کی
کتابیں۔ جگہ جگہ انسانی جسم کی تصویریں تھیں۔ عجیب اور مختلف زاویوں سے
کھینچی ہوئی۔ وہ چائے بنا لائی اور اس نے کتاب مجھ سے لے کر آہستہ سے
میز پر رکھ دی۔
" ہماری دُعا ہے کہ ہمیں ہر روز صبح صبح آپ کے ہاتھوں کی چائے نصیب ہو" میں

نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اور وہ جو کسی بھی موضوع پر مردوں سے بحث کر لیتی تھی۔

اور ....

جس کا چہرہ ہر جذبے سے عاری ہوتا تھا — میرے اس جملے سے گلنار ہو گئی۔ اس نے ہاتھوں سے چہرہ ڈھکے بغیر اپنے گلابی چہرے کا تاثر چھپانے کے لیے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ اور بغیر انگلیوں کی درازوں میں سے جھانکے، کچھ لمحے بعد براہ راست کچھ سیکنڈ کو میری طرف دیکھا، ایک نظر امیؔ کی طرف اٹھائی اور آہستہ سے خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔

پالنا

ہسپتال کے بیڈ پر لیٹی لیٹی جانے میں کن خیالوں میں گم تھی کہ پھر اس ننھی کی کلکاریاں میرے کانوں سے ٹکرائیں۔ ایک بار پھر میرا دل بے قرار ہو گیا۔ درد کی کتنی لہریں میرے سینے کے اندر اٹھیں، دوسرے بیڈ پر سوئی ہوئی اس کی ماں کو میں نے آواز دینا چاہی۔ لیکن اس بار میں ایسا نہیں کر سکی ـــــ مجھے اس سے ڈر لگنے لگا تھا۔

آج بھی میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میرا بلڈ پریشر ہائی تھا۔ پیروں پر سوجن تھی۔ ڈاکٹروں نے مجھے ہلنے جلنے میں بھی احتیاط برتنے کو کہا تھا۔ ٹھیک سے لیٹنے میں بھی تکلیف ہوتی تھی مجھ کو، میں نیم دراز اس کے پالنے کی طرف منہ کیے پڑی رہی۔ میرا جی چاہا کہ ایک ڈوری اس پالنے کے ساتھ باندھ لوں اور دھیرے دھیرے اسے ہلکورے دیتی جاؤں کہ کل رات کا کھِلا یہ نہایت نازک پھول کہیں پھر سے بے چین نہ ہو جائے اور اگر ہو جائے تو ـــــ میٹھی روئی کے اس گلابی گالے کو گود میں بھر لوں۔ سینے سے لپٹا لوں۔ اس کے سیاہ ریشم جیسے نرم بالوں پر اپنے ہونٹ رکھ دوں اس کے سارے آنسو لے لوں کہ اس کی کلکاریاں میری رُوح میں درد بن کر گھل جاتی ہیں۔ پیاسی ممتا کا سمندر سینے کی اتھاہ گہرائیوں میں جانے کہاں سے موجزن ہو جاتا ہے اور میں ڈوب جاتی ہوں اپنے ہی بہائے ہوئے آنسوؤں کے طوفان میں۔

اور کتنے دن مجھے بیڈ ریسٹ لینا پڑے گا۔ اُکتا گئی تھی میں اس طرح لگاتار بستر پر پڑے رہنے سے۔ ابھی تین سال پہلے کی ہی تو بات ہے، کتنے ہی دن میں نے ایک نرسنگ ہوم میں

بیڈ ریسٹ لیا تھا ——— اور پھر ——— ایک ننھا سا پیر میرے پیٹ کے اندر ہل رہا ہے۔ شکر ہے اس نے میرا دھیان اپنی طرف موڑ دیا۔ ورنہ یہ میں کیا یاد کرنے لگی تھی۔ ڈاکٹروں نے مجھے کوئی بھی ناخوشگوار بات سوچنے سے منع کیا ہے۔ جیسے کسی کا سوچ پر اختیار ہوا کرتا ہے بھلا۔ میں اپنے ذہن و دل کو کیسے قابو میں رکھوں۔ تین برس سے میرے اندر یہ غم قطرہ قطرہ رِس رہا ہے۔ پھر یہ تو ایک داخلی عمل ہے۔ اس پر میرا کیا زور چل سکتا ہے۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا مگر اور بھی ایسا سوچنے کا حق رکھتے ہیں۔ مجھ میں کیا خاص بات ہے۔ ہاں ایک بات تو مجھ میں تھی خاص طور سے۔ وہ یہ کہ میرے اندر لڑکپن سے ہی ماتا بھری تھی۔ بچوں سے کچھ زیادہ ہی لگاؤ تھا مجھے، چاہے وہ انسان کے ہوں یا جانوروں کے۔ پھر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ انسان جس چیز کی قربت چاہتا ہے وہی اس سے دور ہو جاتی ہے۔

اُس رات بھی میں ایسے ہی نڈھال سی ہسپتال میں پڑی تھی۔ ہلکا ہلکا دردِ زہ لے کر داخل ہوئی تھی میں۔ سینئر ڈاکٹر نے صبح پانچ بجے کا وقت بتایا تھا اور جونیئر ڈاکٹر کے حوالے کر کے گھر چلی گئی تھیں۔ ساری رات میں درد سے تڑپتی رہی۔ حالات کی ستم ظریفی کہ میرے پاس کوئی نہ تھا۔ میری خالہ کا اسی دن انتقال ہو جانے کے سبب سب لوگ وہیں گئے تھے۔ میری بہنیں، امّی ——— صرف وہ تھے۔ میرے شوہر، باہر بے قرار، پریشان اور اکیلے۔

جونیئر ڈاکٹر کے بارے میں بعد میں معلوم ہوا کہ بارہ برس میں ایم۔بی۔بی۔ایس مکمل کیا تھا۔ ۲/۱ ۴ بجے جب میری حالت غیر ہونے لگی تو جونیئر ڈاکٹر نرسوں کا ایک جھنڈ لے کر میرے پاس آئی اور میرے پیٹ پر اسٹیتھکوپ رکھتے ہوئے بولی۔ ”ابھی آدھا گھنٹہ ہے تمھاری چیخوں سے سب کی نیند خراب ہو رہی ہے۔ پانچ بجے میڈم کو گاڑی لینے جائے گی۔“ میں روتی رہی، کراہتی رہی کہ مجھے تھیٹر میں لے جائیے۔ میرا آپریشن کر ڈالیے۔ ورنہ میں مر جاؤں گی۔ میرے بچّے کو کچھ ہو جائے گا۔

اس نے میری کسی بات کا نوٹس نہ لیا اور میڈم کے کہے ہوئے پانچ بجے کے وقت پر ہی ہر بات کا دار و مدار مان کر بے فکر ہو گئی۔ جیسے کہ میڈم کوئی ماہر نجوم ہو اور اس کے بتلائے ہوئے وقت میں تبدیلی ہونے کی غالباً کوئی گنجائش نہ ہو۔ میں درد سے بے حال تھی۔ میرا گلا سوکھ گیا تھا چیخ چیخ کر۔ اپنی حالت انھیں سمجھانے کی مجھ میں کوئی طاقت نہ تھی۔ کوئی میری بات سمجھنے کے

موڈ میں نہ تھا۔ خود میں بھی نادان تھی۔ بالکل ناسمجھ اور ناتجربہ کار۔ پونے پانچ بجے میں درد سے بے حال، کرب و اذیت کی زنجیروں میں جکڑی آزاد ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ مجھ پر ہر دوسرے سیکنڈ میں غشی کا دورا پڑتا اور ہر تیسرے سیکنڈ میں ہوش آجاتا اور ہوش کا ہر ہر سیکنڈ، سو سو برچھیوں کی چبھن سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتا۔ گھر سے نکلنے سے پہلے میں نے خوب کس کر چوٹی گوندھی تھی۔ جانے کب وہ کھل گئی تھی اور میرے بال بکھر کر میرے مسلسل تڑپنے سے ٹوٹ ٹوٹ جاتے، مسہری کے سرہانے لگی چھوٹی چھوٹی سفید آہنی سلاخیں بھینچ بھینچ کر درد برداشت کرنے کی کوشش میں میرے ناخن میری ہتھیلیوں میں چبھ چبھ جاتے تھے اور میری ہتھیلیاں لہولہان ہوگئی تھیں۔ درد کی شدت سے میں نے اپنے ہونٹ کاٹ کاٹ کر زخمی کر دیے تھے۔ میری ایک ہی فریاد تھی کہ میرا جسم چاک کر کے مجھے اس درد سے بچائے کوئی۔ لیکن کسی کے پاس میرے لیے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ کوئی وقت نہ تھا۔

پھر مجھے یوں لگا جیسے میرا بچہ میری کوکھ میں زور سے تڑپا ہو، شاید اس کے دنیا میں آنے کی آخری جدو جہد کی کوشش کا ایک شکستہ حصہ تھا یہ تڑپنا کہ ایک نرس نمودار ہوئی۔ جانے کیوں ہنس رہی تھی وہ جب کہ رو رو کر میرے آنسو تک سوکھ چکے تھے۔ اور چلا چلا کر میرا گلا پھوڑے کی طرح دکھ گیا تھا۔ وہ اپنے سیاہ چہرے پر بڑے بڑے سفید دانت سجائے اپنے مخصوص جنوبی ہندی لہجے میں بولی۔ "کیوں دیماگ کھراب کرتے ہے۔ ابی تھوڑی دیر میں گاڑی ڈاکٹر کو لینے کو جائے گا۔ سو جاؤ سو جاؤ۔" پھر اس نے اسٹیتھکوپ سے بچے کی دھڑکن چیک کرنا شروع کی۔ کچھ لمحے بعد بھاگ کر گئی اور ڈاکٹر کو ساتھ لائی، اس نے بھی میرا فیٹل ہارٹ (FOETAL HEART) چیک کیا۔ فوراً مجھے سٹریچر پر ڈال کر آپریشن تھیٹر پہنچایا گیا اور گاڑی میڈم کو لینے کے لیے بھجوائی گئی جیسے تیسے وہ آئیں تو بے حد صحت مند، گول مٹول، تقریباً دس پونڈ کے بیٹے کو میں نے جنم دیا ــــ لیکن ــــ

لیکن کسی نے اس کی پہلی چیخ نہیں سنی۔ اسے سامنے والی لمبی میز پر لٹا دیا گیا۔ وہ گورا چٹا تھا ــ گھنگھریالے کالے بالوں والا پھول سا میرا منا چپ چاپ آنکھیں موندے پڑا تھا۔ اور میڈم اس کے بے جان، ننھے منے ہونٹوں سے منہ لگائے اس کے پھیپھڑوں میں مصنوعی ہوا

بھرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر اس کی نازک سی گردن کبھی دائیں طرف ڈھلک جاتی کبھی بائیں طرف۔ اس کی ناک اور ہونٹ بہت خوب صورت تھے۔ اس کی آنکھیں جو بند تھیں اپنی پھوپھی جان جیسی بڑی بڑی لگتی تھیں۔ جانے ان آنکھوں کا رنگ کیسا ہوگا۔ اس نے تو ایک پل کو بھی آنکھیں نہ کھولی تھیں نہ ہی میں نے اس کی آواز سنی۔ وہ ننھا سا وجود میرے سامنے بے جان پڑا ہوا تھا۔ کچھ دیر پہلے کیسے ہمک رہا تھا میری کوکھ کے اندر۔ شاید زندہ رہنے کی آخری کوشش کر رہا ہو۔ آخری مرتبہ کتنے زور سے تڑپا تھا وہ کہ میرا سارا جسم بھی ہل اٹھا تھا اس کے ساتھ۔ شاید اُسی وقت اس کے سانسوں کی ڈور ٹوٹ گئی ہو۔۔۔ جبھی تو واپس بھاگ گئی تھی وہ نرس۔

صبح کاری ڈور میں لگے نوٹس بورڈ پر ڈیلیوری والے کالم میں اس کی موت واقع ہو جانے کی وجہ ”کوڈ ایسفکسیا (CHORD ASPHYXIA) درج کی گئی تھی۔ یعنی گلا گھونٹے جانے کی وجہ سے اس کی جان چلی گئی تھی۔ میں جانتی تھی کہ یہ سب جھوٹ تھا۔ نال سے اس کا دم نہیں گھٹا تھا۔ جنم دینے کے لیے مجھے ان لوگوں کی مدد اور تعاون چاہیے تھا جو انھوں نے اپنی نااہلیت کی بنا پر نہیں دیا۔ اور وہ زیادہ دیر پیٹ میں رہنے کی وجہ سے دم گھٹنے سے مر گیا تھا۔ اُسے ماں سے آکسیجن نہ ملی۔ اُسے خود سانس لینا تھا۔ دنیا کی کھربوں گیلن آکسیجن میں سے اس کے حصے میں ایک سانس نہ لکھی تھی کاتبِ تقدیر نے، تو کسی کو کیا دوش دیں۔ بھول سے کیوں آ گئی تھی میں اس نرسنگ ہوم میں، اس کی ظاہری شان دیکھ کر۔ ورنہ اگر ان کے پاس کچھ قابل ڈاکٹروں کا عملہ ہوتا تو اس وقت یہ آنسو، یہ شکست، یہ احساسِ تنہائی مجھ پر مسلط نہ ہوتا۔ اگر ان کے پاس آکسیجن دینے کا آلہ ہوتا تو شاید میرے جگر کا یہ پارہ یوں بے جان نہ پڑا ہوتا۔ میں یوں نامراد و ناکام نہ ہوتی۔

پھر وہ اُسے میرے سامنے سے لے گئے۔ صرف اس کا چہرہ چھُوا تھا میں نے۔ جب اسے لے جایا گیا۔ سرد شبنم میں نہائے ہوئے پھول کی طرح۔ میرے کلیجے سے درد کے قطرے رِس رہے تھے۔ میرا سارا وجود آنسو بن کر بہہ جانا چاہتا تھا۔ جانے کیوں نہ بہا۔ کیسے یہ غم برداشت کیے جیتی رہی۔

کچھ دیر بعد دو نرسیں آدھے چہروں پر نقاب ڈالے میرے دونوں طرف کھڑی تھیں۔

میرے سینے سے درد اٹھ رہا تھا۔ میرا گریبان، میرا دامن بھیگے ہوئے تھے۔ میری گود ویران تھی۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ میرے پلنگ کے پاس کا پالنا سونا تھا۔ میری ممتا کا خون میری آنکھوں سے میرے سینے سے بہہ رہا تھا۔ نرسوں کے ہاتھوں میں بڑے بڑے سرنج تھے۔ میرے منّے کا رزق کٹ ہی چکا تھا۔ اب دودھ کے وہ دھارے بھی خشک ہونے والے تھے جو اس کے کچھ مہینے میرے وجود کا حصّہ ہونے کے شاہد تھے۔ اگر وہ میرے پاس ہوتا تو میں یوں پہلے پہل ماں بنتے بنتے رہ نہ جاتی۔

شاید اس وقت وہ میری چھاتی سے لگا دودھ پی رہا ہوتا اور میں اس کے منّے سے سر پر ہاتھ پھیر رہی ہوتی۔ اس کے ننھے سے جسم کی بناوٹ دیکھ رہی ہوتی۔ اُن سارے وسوسوں کو دور کر رہی ہوتی جو اس کے میرے اندر چھُپے رہنے کے دنوں میں میرے دل میں اٹھا کرتے تھے۔ میں اس کے پیروں کی ساخت دیکھ رہی ہوتی کہ کہیں کوئی پیر ٹیڑھا تو نہیں، کوئی انگلی کم یا زیادہ تو نہیں۔ اس کے ہاتھ مجھ جیسے ہیں کہ اپنے ابّا جیسے۔ لیکن نہیں۔ وہ تو اپنا چھوٹا سا سرد اور سفید جسم لیے مٹی کی کتنی ہی تہوں کے نیچے جا چکا تھا۔ کیسے پاتی اسے میں۔ کہاں سے لاتی اسے۔ میرا منّا، میرا پھول، یہ آنسو آج اتنی تیزی سے کیوں بہہ رہے ہیں۔ ڈاکٹروں نے مجھے رنجیدہ رہنے سے منع کیا ہے۔ اس سے مجھے نقصان پہنچ سکتا ہے مدّت کے بعد میرے اندر کھلنے والی اس کلی کے لیے بھی یہ اچھا نہیں ہے۔ پھر میں کیوں ایسا سوچنے لگ جاتی ہوں۔ مجھے وہ سب بھول جانا چاہیے۔

ساتھ والے پلنگ کے پالنے میں لیٹا ہوا مُنّا سا بچّہ برابر روئے جا رہا تھا۔ اور اس کی ماں بے خبر سو رہی تھی۔ وہ اب تک کئی بار جاگ جاگ کر روتا رہا تھا۔ ہر دفع میں نے ہی اس کی ماں کو جگایا تھا میں اس کی حالت سمجھ سکتی تھی۔ وہ دردِ زہ سے تڑپ تڑپ کر آزاد ہو جانے کے بعد سوئی تھی۔ اسی لیے خود سے جاگ نہیں پا رہی تھی۔ جگانا پڑتا تھا اسے۔ لیکن کیا میرا جگانا اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔

جانے کیا ہو گیا ہے لوگوں کو یا پھر میں ہی زیادہ حسّاس ہوں۔ ورنہ ماں تو وہی تھی اس کی۔ سوچتی ہوگی کچھ دیر رولے گا تو کیا ہو جائے گا۔ بچّہ ہی تو ہے۔ لیکن مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا۔

جب پہلی بار جگانے پر اس نے ٹیوب لائٹ روشن کی تھی تو میں نے منّی سے آنکھ، جس کے پپوٹوں میں سے ابھی پلکیں بھی نہیں پھوٹی تھیں، کے کونے پر آنسو کی ایک ننھی سی بوند چمکتی دیکھی تھی۔

پہلی بار تو وہ ایک دم سے بچّے کو سہلانے لگی۔ دوسری دفعہ جب میں نے اسے آواز دی تو اس نے کچھ پل میری طرف دیکھا۔ تاثرات شاید ناگواری کے تھے، یہ ننھی سی جان اگر روتی نہیں تو میں اسے کیوں جگاتی۔ کیوں میں اس کی نیند خراب کرتی بھلا۔ اس معصوم کا اس طرح بلکنا دیکھا نہ جاتا مجھ سے اور جب تیسری بار مجھے اسے پھر جگانا پڑا تو وہ ذرا تیکھے پن سے بولی "سوری (SORRY) اس کے رونے سے آپ کے آرام میں خلل پڑتا ہے نا۔ اسی لیے آپ مجھے فوراً جگا دیتی ہیں۔" اس کے بعد وہ اسے دودھ پلانے میں مشغول ہو گئی ہیں اُسے کیسے سمجھاتی اس کے رونے سے میرے آرام میں کوئی خلل نہیں پڑا تھا، میرے دل کا سکون ضرور لٹتا تھا اس کی تکلیف کے خیال سے۔ بچے کی پہلی چیخ اس کی زندگی کی ضامن ہے مگر یوں رات رات بھر بے قرار رہنا کسی پریشانی کی وجہ ہے۔ وہ بھی تو اس دنیا میں آنے کی جدوجہد کرنے سے تھک چکا تھا قاعدے سے اسے کئی گھنٹے آرام سے سونا چاہیے تھا۔ اُسے میں کیسے بتلاتی کہ بچّے تمھارے اور ہمارے نہیں ہیں۔ یہ تو سب کے ہوا کرتے ہیں۔

کب سے روئے چلا جا رہا تھا وہ اگر میں نے اس کی ماں کو نہ جگایا تو وہ ایسے ہی روتا رہے گا۔ جانے کب تک۔ پھر جانے کیا ہو۔ کہیں یہ پالنا... نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ مجھ پر خالی پالنے دیکھ کر وحشت طاری ہو جاتی ہے۔ شاید ایسے کسی صدمے سے میری موت ہی واقع ہو جائے اور یہ ننھی سی جان —— تو کیا اس کی باتوں کے ڈر سے میں اسے یونہی بلکنے دوں؟ شاید اسے بھوک لگی ہو۔ ایک گھونٹ پی کر ہی تو سو جاتا ہے وہ۔ اس طرح روتے روتے مچل مچل کر کہیں اس نے اپنی ناف نہ زخمی کر لی ہو۔ مجھے بہر حال اس کی ماں کو جگانا ہی ہوگا۔ چاہے کچھ بھی کہے وہ۔ یہ فیصلہ کر کے میں نے اسے آواز دی اور مطمئن ہو کر دوسری طرف کروٹ بدل لی۔

اس کے کانوں میں دور کسی مندر سے آتی ہوئی آرتی کی آوازیں آرہی تھیں۔ کچھ قدم کے فاصلے پر پیر بابا کا آستانہ تھا۔ وہ چلتی جا رہی تھی۔ سڑک پار کرنے لگی تو اس نے اپنی پڑوسن کو جاتے دیکھا۔ وہ سر پر اسکارف باندھے ہاتھوں میں ایک ریشمی رومال میں موم بتیاں لپیٹے چرچ جا رہی تھی اس کے مضطرب قلب کے بالکل قریب سے ایک لمحے کے لیے سکون کی لہر سی دوڑ گئی۔ تیز تیز پڑتے ہوئے بے تکے قدم ایک رفتار سی پکڑنے لگے۔ اور وہ دھیرے دھیرے اطمینان سے چلنے لگی۔

ایک خواب دیکھا تھا اس نے۔ مگر وہ خواب صرف اس کا نہ تھا۔ اس میں کتنے نرم و نازک ریشمی تار تھے جنھوں نے اس کے تخیل کی تخلیق کو سہارا دیا تھا۔ اس کی ذاتی غرض تو نہ تھی۔ تو پھر اتنی آندھیاں کیوں۔ کبھی کبھی تو وہ اتنی اکیلی پڑ جاتی کہ خدا کے وجود پر اس کا اعتقاد کمزور پڑنے لگتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ابھی اوپر کوئی طاقت ہے۔ ضرور ہے۔ جبھی تو اس کی پڑوسن شمعیں لیے گرجا گھر جا رہی تھی۔ جبھی تو دور سے آتی ہوئی آرتی کی مدھر آواز میں کتنی ہی آوازیں مل کر نغمہ سرا تھیں۔ جبھی تو پیر بابا کے مزار سے اٹھتے ہوئے لوبان کی خوشبو ساری فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور ساری فضا "اس" کی عظمت کا اعتراف کر رہی تھی۔

کبھی کبھی نعمت بھی مصیبت بن جاتی ہے۔ قدرت نے اسے بنانے میں اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا۔ اس کا دل اس سے بھی زیادہ حسین تھا۔ اس کی رُوح اس کے نکھرے ہوئے سپید رنگ سے بھی پاکیزہ تھی۔ انسان اور انسانیت سے اسے اپنے وجود سے بھی زیادہ محبّت تھی۔ جبھی تو اس نے یہ راستہ چنا تھا۔ اتنی بڑی تعلیمی سند تھی اس کے پاس اور اس نے ـــــ ایک معلمہ کی نوکری کرنا پسند کی ـــــ دور افتادہ گاؤں میں۔

جب اسے محکمۂ تعلیم سے نوکری کا آرڈر ملا تو وہ کتنا خوش ہوئی تھی۔ پہلی بس پکڑ کر وہ جوائن کرنے کے لیے روانہ ہوگئی۔ شہر میں پلی یہ معصوم سی لڑکی جب بس میں بیٹھی تو آس پاس کے عجیب و غریب حلیے کے دیہاتیوں کو دیکھ کر اسے ذرا بھی عجیب نہ لگا۔ ساری بس میں ان کے مشقّت بھرے پسینے کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی بھی نہ تھا اس سے ملتے جلتے حلیے والا۔ مگر اسے تو یہی پسند تھا۔ یہ میلے کچیلے بچّے، جو اپنے محنت کش والدین کے ہمراہ شاید کسی تہوار کے لیے خریداری کر کے گھر لوٹ رہے تھے۔ یہ ہی تو بسے تھے اس کے خوابوں میں۔ اس کے دوپٹے کی جھالروں کے ریشمی تانے بانے بن کر اس کے وجود سے لپٹے تھے۔ یہ ہی تو تھے وہ ناتراشیدہ ہیرے، جنھیں وہ سنوارے گی نکھارے گی۔ زیورِ تعلیم میں نگینوں کی طرح جڑے گی۔

بس سے اترتے ہی تازہ ہواؤں کے جھونکوں نے اس کے ذہن کو معطر کر دیا۔ اور پھر نئی ٹیچر کا اس چھوٹے سے اسکول میں کتنا محبت بھرا استقبال ہوا۔ اسکول کے بالکل سامنے سے ایک چھوٹی سی ندی بہتی تھی۔ اس کے کناروں پر خودرو جنگلی پھولوں کی قطاریں اُگ آئی تھیں۔ رنگ برنگے پھول۔ ندی کے شفاف پانی میں سے کئی مختلف رنگوں اور جسامت کے پتھر ایسے اپنی اپنی جگہوں پر بچھے تھے جیسے کسی نے اپنے ہاتھوں سے سجایا ہو۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ندی نہ ہو کوئی ہار ہو جس کے بیچ میں کسی ماہر جوہری نے ہیرے جڑے ہوں اور کناروں پر پھولوں کی کیاریاں منقش کی ہوں۔

ننھے منے نازک ہاتھوں نے اپنی نئی ٹیچر کو اپنے اپنے حصّے کے پھول پیش کیے تو وہ

جھوم اٹھی۔ ہر چہرے پر خوش آمدید لکھا تھا۔

یہ سچ مچ کا استقبال تھا۔ بے لوث سادہ اور معصوم۔

اس کا جی بے اختیار چاہا کہ وہ ان سب کو ایک ساتھ اپنی باہوں میں لے لے۔ اسے لگا جیسے ماں سرسوتی کی طرح اس کی کئی باہیں نکل آئی ہوں اور وہ ان سب بچوں کو خود سے لپٹائے ناچ رہی ہو۔ پھولوں کے فرش پر اور آسمان سے پھولوں کی بارش ہو رہی ہو۔

کچھ ہی مہینوں میں وہ چھا گئی سارے گاؤں پر۔ اس نے انھیں انسانوں کی طرح جینا سکھایا۔ سکول میں کتنے ہی بچوں کا اضافہ ہوا۔ بڑوں کو بھی لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس کی تعریف ضلعے کی افسرِ تعلیم تک پہنچ گئی۔ اور کچھ دن بعد ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر سکول کا معائنہ کرنے آئیں۔ عمر کوئی ۵۰ برس کے قریب۔ بھاری بھر کم ڈیل ڈول۔ شادی نہیں کی تھی انھوں نے۔ کہتے ہیں انھیں کوئی پسند ہی نہیں آیا۔ یا شاید ———— سانولی رنگت، چپٹی ناک، چہرے پر زبردستی کھرچے ہوئے مہاسوں کے کئی نشان۔ جیپ سے اترتے ہی وہ خوش ہو گئیں۔ سکول، نقشوں اور چارٹوں سے سجا ہوا تھا۔ صاف ستھرے کچے صحن پر پانی چھڑکنے سے فضا میں مٹی کی سوندھی سوندھی مہک رچی ہوئی تھی۔ "ڈی۔ای۔او" (D.E.O.) صاحبہ اپنی طرف سے سرپرائز وزٹ دینے صبح صبح نمودار ہوئی تھیں۔ وہ خوب سمجھی تھیں اس طرح کی سجاوٹ اور ٹائم ٹیبل۔ لیکن ٹائم ٹیبل کے مطابق بچے سچ مچ ریاضی سیکھ رہے تھے۔

انھوں نے جب اسے دیکھا تو حیران رہ گئیں۔ سفید گلاب سی معصوم تر و تازہ، نہایت متناسب جسم۔ آنکھوں میں خود اعتمادی کی جھلک، اس کی نظر دروازے پر پڑی تو انھیں اپنے سامنے دیکھ کر اس نے ادب سے سلام کیا۔ مگر وہ جانے کیوں بگڑ گئیں اور اسے ڈانٹ دیا کہ اسے آنے والوں کی خبر ہی نہیں رہتی۔ وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس دی انھوں نے اسے بدتمیزی سے ہنسنے سے تعبیر کیا اور نہایت بے ہودگی سے اسے ڈانٹتی ہوئی وہاں سے نکل گئیں۔

کچھ دنوں کے بعد اس کے ہاتھ میں اس کی تبدیلی کا پروانہ تھا۔ اسے ایک دور دراز سرحدی

علاقے میں بھیج دیا گیا تھا۔ جہاں موسمِ سرما میں مہینوں کے لیے راستے بند ہو جایا کرتے ہیں اور راشن تک کبھی کبھی ملٹری ہیلی کوپٹروں کے ذریعے بھجوایا جاتا ہے۔ وہاں آبادی بھی بہت کم تھی اور یہ سکول بھی اکلوتا پرائمری سکول تھا۔ جہاں اسے بحیثیتِ سنگل ٹیچر جانا تھا۔

اس گاؤں کے بچّوں سے کتنی محبت ہو گئی تھی اسے۔ یہ بچّے بھی کتنے مانوس ہو گئے تھے اس سے۔ اس کے گھر والے اس تبدیلی کی خبر سن کر تقریباً رو ہی پڑے۔ اس نے ہفتے بھر کی چھٹی کے لیے درخواست لکھی اور ڈی۔ ای۔ او آفس پہنچ گئی۔ اسے تبدیلی منسوخ کرانے کی بات ہی تو کرنا تھی۔ ڈی۔ ای۔ او صاحبہ نے یہ کہہ کر کہ ڈسٹرکٹ ٹرانسفر ہے اور ان کی پہنچ میں نہیں ہے بات ٹال دی۔ اس نے سوچا تھا کہ عورت ہونے کے ناطے وہ اس کی پریشانی سمجھیں گی۔ لیکن بات بالکل الٹی ہی ہو گئی۔ وہ سیدھا ڈائرکٹر کے دفتر پہنچی۔ وہاں تو پی۔ اے صاحب تک سے اپائنٹمنٹ لینا پڑتی ہے ڈائریکٹر صاحب کی تو بات ہی نہیں۔ دفتر میں ایک نورانی چہرے والے ادھیڑ عمر کے سیکشن آفیسر تھے۔ انھوں نے اس کو بڑی اپنائیت اور ہمدردی سے سب کچھ سمجھایا۔ اور مطلوبہ ٹیلی فون نمبر وغیرہ بتلائے۔ اس نے بتلائے ہوئے نمبروں پر پی۔ اے صاحب سے ملاقات طے کی مگر وہ نہیں ملے۔ پسینہ بہاتی ہوئی، دھول میں اٹی وہ پھر سیکشن آفیسر کے پاس پہنچی۔ انھوں نے اسے ٹھنڈا پانی پیش کیا اور آرام سے کرسی پر بیٹھنے کو کہا اور خود فون پر اپائنٹمنٹ طے کر کے اسے وقت بتا دیا۔ کتنا خوش ہوئی تھی وہ ان کے سلوک سے۔ کوئی کوئی انسان کتنا نیک ہوتا ہے۔ خیر دوسرے دن جب وہ پی۔ اے سے ملی تو ناامید ہوتے ہوتے رہی۔ پتہ چلا کہ ڈائرکٹر صاحب تو منسٹر صاحب سے بھی زیادہ مصروف رہتے ہیں۔ پی۔ اے صاحب کئی دن تک ٹالتے رہے کہ صاحب دورے پر گئے ہوئے ہیں۔ اور یہ کہ یہ دورے کہاں ہوتے ہیں اس بات کو صیغۂ راز میں رکھا جاتا ہے آخر یہ دورے اچانک دورے جو ہوتے ہیں۔ جن سے استادوں کی لاپرواہیوں کو کاغذوں کے ذریعے پریشانیوں کے پروانے دیے جاتے ہیں اور کچھ تو ان پروانوں کی مانگوں کو پورا کر کے خود کو پریشانیوں سے آزاد کروا لیتے ہیں۔ اور کچھ قسمت کے مارے برسوں دھکے کھاتے رہتے ہیں۔ پھر کبھی، کہیں، کسی دن، کوئی بندہ خدا کسی کرسی پر آن بیٹھتا ہے تو اُن

قسمت کے ماروں کی سنوائی ہوئی ہے جو محض اپنی کم بخت اور کم وزن جیبوں کی بوسیدگی کی بنا پر ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہے ہوتے ہیں۔

بہرحال ڈائریکٹر صاحب سے خدا خدا کر کے ملاقات ہوئی اور انھوں نے اپنے پی۔اے سے کہا کہ وہ اس سے عرضی لے لیں اور اس پر پھر کارروائی کی جائے گی۔ اس نے عرضی دے دی، پھر انتظار کیا۔ لیکن کوئی خط، کوئی فون، کوئی بلاوا نہ آیا۔ وہ پھر پی۔اے صاحب کے پاس پہنچی۔ غصّہ آرہا تھا اسے۔ کہنے لگے کہ ہم نے بھیج دی ہے آپ کی درخواست آگے۔ آپ ملتی رہیے۔ معلوم کرتی رہیے۔ ملتی رہوں معلوم کرتی رہوں، وہ سوچنے لگی۔ اور میرا اسکول میرے طلبہ۔ ساری کیجول لیوز تو ختم ہونے کو آرہی ہیں۔ یہ سوچ کر اسے اور غصّہ آگیا۔ لہجے کی تلخی پر قابو رکھتے ہوئے وہ بولی کہ قانوناً تو تین سال سے پہلے تبدیلی ہو ہی نہیں سکتی۔ پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔ میں اپنے حق کے لیے لڑوں گی چاہے مجھے منسٹر تک جانا پڑے۔ پی۔اے صاحب ذرا سا مسکرا کر دھیمی سی آواز میں بولے۔ کچھ حق ہماری طرف بھی ہے آپ کا۔ اس نے ان کا اشارہ سمجھ لیا۔ غصّے سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ لیکن خود کو بدستور قابو میں رکھے ہوئے وہ بے وقوفوں کی طرح بولی۔ شکریہ، شکریہ بہت بہت شکریہ جیسے سمجھی ہی نہ ہو یا یہ سمجھی ہو کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارے محکمے کا بھی فرض ہے کہ اپنے معلموں کی پریشانیوں کے حل تلاش کرنا۔ لیکن پی۔اے صاحب بھی بڑے درجے کے گھاگ اور مکار تھے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا انھوں نے۔ سمجھ گئے کہ اسے ناگوار گزر رہا ہے۔ اپنی آواز کو ویسے ہی دبائے ہوئے دھیمی سرگوشیوں میں بولے کہ ہم تو تنخواہ ہی اس بات کی لیتے ہیں کہ اپنے معلموں کی سہولیات کا خیال رکھیں اور اس کے بعد دانت نکال کر ہنسے۔ وہ دوبارہ ان کا شکریہ ادا کرنے والی تھی کہ ایک لڑکی داخل ہوئی، درمیانہ قد، عام سی قبول صورت مگر نہایت ماڈرن لباس سے آراستہ۔ اس نے آتے ہی اپنی معطر زلفوں کو لہرایا اور ایک ادا سے پی۔اے صاحب کو سلام کرتی ہوئی ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے گردن کو خم دے کر کچھ اس طرح کہ بالوں کی لٹیں اس کے آدھے ماتھے پر بکھر گئیں، فلمی اداکاراؤں کی طرح ہونٹ بھینچ کر مسکراتے ہوئے پی۔اے صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور بولی کہ اس کی کل والی

ٹرانسفر کی عرضی کا کیا ہوا۔

پی۔ اے صاحب اس کے ڈیپ کٹ (DEEP CUT) گریبان پر نظریں جمائے جمائے بولے۔ " تھا تو ام میچور مگر ہم نے کروالیا کام۔ یہ رہا آرڈر" وہ کچھ اور کہنے والے تھے کہ لڑکی نے جلدی سے ان کے ہاتھ سے آرڈر کاپی لی اور شکریہ بھی ادا نہ کیا۔

اور لڑکی یہ جا وہ جا۔

پی۔ اے صاحب کھسیانے سے ہوکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ وہ بھی اس تماشے کو مبہوت دیکھتی رہی۔ اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی وہاں سے نکل آئی۔ وہ سیکشن آفیسر کے کمرے کے راستے پر ہولی۔ جانے کیسے کیسے خیال آرہے تھے اسے۔ وہ اپنے لمبے خوبصورت بال بکھیرے پی۔ اے صاحب کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی ہے اور وہ اپنے تمباکو والے پان کے عادی ،پیلے پیلے ، بڑے بڑے دانت نکالے ہنس رہے ہیں۔ اس کے ہاتھ میں اس کی تبدیلی کے منسوخ ہو نے کا آرڈر ہے اور انھوں نے اس کا ہاتھ زور سے پکڑ رکھا ہے۔ مارے گھبراہٹ کے اسے پسینہ آگیا۔ تصوّر ٹوٹ گیا شکر ہے۔ اسے ابکائیاں سی آنے لگیں۔ اس نے خود کو سیکشن آفیسر کے کمرے میں پایا۔ لنچ ٹائم ہوچکا تھا۔ وہ اپنے سفید داڑھی والے چہرے پر دنیا بھر کا نور لیے اکیلے اپنے کام میں مگن تھے انھوں نے اسے دیکھ کر نہایت نرمی سے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور خود اٹھ کر اسے پانی کا گلاس دیا۔ مارے گھبراہٹ کے اس کا برا حال تھا۔ اس کا جی چاہا کہ سارا ماجرا ان سے کہہ دے مگر ---- اتنا بولی کہ جانے کب میری مشکل حل ہوگی۔ انھوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا جیسے کہہ رہے ہوں کہ جلد ہی تمھارا کام ہوجائے گا۔ دنیا میں سب لوگ ایک سے نہیں ہوتے۔ ان کا تشفی بھرا ہاتھ سر پر محسوس کر کے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں اور وہ سسک کر رو پڑی۔ وہ اس کا سر سہلاتے رہے۔ پھر اس کے شانے، پھر کمر --- اور وہ اچانک چونک پڑی۔ اس نے جلدی سے ان کا سانپ کی طرح رینگتا ہوا ہاتھ جھٹک دیا اور یکلخت وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

اسے کچھ ہوش نہ رہا۔ جیسے ہزاروں اژدہے پھن پھیلائے چاروں طرف سے اسے گھیر

رہے ہوں اور اسے کوئی راہ نہ سجھائی دے رہی ہو۔ کب کس طرف سے کون اسے آڈسے کیا خبر۔
اس لیے وہ بھاگتی رہی۔ جب تھک کر چور ہوگئی تو اس کی رفتار ذرا کم ہوئی۔ اس کے ہوش و
حواس کچھ اعتدال پر آنے لگے۔ اس نے خود کو گھر جانے والی سڑک پر پایا جہاں قریب
ہی ایک پارک تھی۔ وہ پارک میں داخل ہوئی۔ پتھر کی ایک بنچ پر بیٹھ کر اس نے پرس میں سے
قلم اور کاغذ نکالے اور استعفےٰ لکھا۔ ابھی جا کر ان کے منہ پر دے مارے گی۔ اس ارادے
سے جانے کیا بڑبڑاتی ہوئی وہ اٹھی۔ آسمان کی طرف نظر اٹھائے دل ہی دل میں جانے کیا
سوچتی رہی۔ منظر دھندلا سا رہا تھا۔ آنکھوں سے موتی کا ایک ٹکڑا استعفےٰ پر گرا۔ وہ دھیرے
دھیرے چلتی ہوئی پارک سے باہر آگئی۔ سورج کب ڈوبا اسے کچھ خبر نہ تھی۔ شام اترنے ہی
والی تھی۔ سامنے سے اس کی پڑوسن ہاتھ میں شمعیں لیے آرہی تھی۔ دور کسی مندر سے آرتی کی
مدھر آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ سڑک کے اس پار پیر بابا کی درگاہ سے اٹھتی ہوئی لوبان
کی خوشبو سے فضا میں ایک مقدس سا سکون تھا۔

آہستہ آہستہ وہ بھی اس پر سکون ماحول کی ایک شے بن گئی۔ دل سے رنج اور غصے
کا تاثر جانے کب غائب سا ہوگیا۔ اس میں ہمت آگئی۔ وہ بزدلوں کی طرح میدان نہیں
چھوڑے گی چاہے کتنا بھی وقت لگے۔ وہ لڑے گی۔ اپنی پاکیزگی کو ڈھال بنا کر وہ اپنی جنگ
خود لڑے گی۔ اس نے استعفےٰ پھاڑ دیا اور واپس پارک میں داخل ہوئی۔ پتھر کے بنچ پر بیٹھ کر
اس نے ایک اطمینان بھری لمبی سانس لی۔ اور بغیر تنخواہ کے لانگ لیو کی عرضی لکھنے لگی۔

○○

آئینہ

سامنے کی سڑک سے گزرتی ہوئی بے رنگ بالوں اور چیتھڑا ساڑی میں لپٹی، راستوں سے ردی اٹھانے والی عورت نے احتیاط سے اپنے بچے کو، گل کے کمبل میں لپیٹے گود میں لے رکھا تھا۔ کمبل ایک ہی رات میں اپنی چمک کھو چکا تھا۔ اور اب اس میں سے گل کے بدن کی خوشبو کے بجائے یقیناً نوزائیدہ پلوں کی لجلجی بو آ رہی ہوگی۔ کس قدر پریشان کیا تھا گل نے مجھے کل شام۔

"گل کہاں گئے؟"... "کہاں گئے؟" — "کہاں چلے گئے" یہ خیال دماغ سے پتھر کی طرح ٹکرایا تھا آنکھوں میں ان کی صورت گھوم گھوم گئی۔ دل سینے میں اچھل اچھل گیا۔ کئی کئی خیال آنے لگے۔ بُرے بُرے سے عجیب عجیب سے تصور نے ایک پل میں دو زینے طے کیے۔ گلی سے دوڑتے ہوئے نکڑ پر آکر چھوٹی سڑک پر نظر دوڑائی۔ سڑک پار کی۔ سامنے کی پارک میں جاکر بہت سے بچوں کے درمیان سے انھیں ڈھونڈ نکالا۔ سینے سے لگانے سے پیشتر سفیدی مائل لاجوردی گالوں پر دس دس بوسے ثبت کیے، آنکھوں سے پہلی برسات کے قطروں جیسے موٹے موٹے کچھ آنسو ٹپکائے اور انھیں گود میں بھر کر دو زینے چڑھ کر گھر کی بالکنی میں آکر دم لیا۔ مگر درحقیقت میں ابھی ڈرائنگ روم کے دروازے کے باہر بالکنی میں ہی کھڑی تھی۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی چھوٹو نے بتایا کہ گل کہیں چلے گئے ہیں۔ پریشان سی میں تب ہی سے تھی جب میں دفتر سے لوٹی اور میرے نکڑ میں داخل ہوتے ہی ساری کالونی کی بجلی بند ہو گئی۔ اتنی دیر مجھے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی اور پھر سردیوں میں شام بھی تو بہت جلد ہو جاتی ہے گو کہ ابھی موسمِ خزاں پوری طرح گیا نہیں تھا۔ درختوں کے کئی پتوں نے ابھی شاخوں کی انگلیاں تھام رکھی تھیں۔ پہلے کبھی مجھے اتنی دیر نہیں ہوئی تھی۔ راستے بھر یہ ہی سوچتی رہی تھی کہیں بچے میرے انتظار میں بالکنی سے میری راہ دیکھنا نہ شروع کر دیں۔ کہیں اندھیرے میں ڈر نہ رہے ہوں۔ گھر آئی تو ڈرائنگ روم میں بٹیا اپنے ٹیوٹر سے پڑھ رہی تھیں۔

باہر برآمدے میں بھی کرسیاں خالی تھیں اور چھوٹو اندر سے اکیلا نکلتا ہوا دکھائی دیا ورنہ میری عدم موجودگی میں گل، چھوٹو (جو پچھلے پانچ سال کے عرصے میں کافی بڑا ہوگیا تھا) کے آگے پیچھے ہی گھوما کرتے اور چھوٹو بھی انھیں لیے لیے ہی کام وام کرتا۔ یہ اپنی دونوں منی منی سی گول گول ٹانگیں اس کے دونوں کندھوں کے پیچھے سے آگے کو لٹکائے اس کا ماتھا کم اور بال زیادہ پکڑے ہوئے اس پر حکم چلاتے رہتے۔ دن بھر چھوٹو سے ہی لگے لگے گھومتے۔ ان کے ابّو کی باری تو شام کے بعد آتی۔ خیر پتہ چلا کہ ٹیوٹر سے یہ پہلے ہی پڑھ چکے تھے۔ پڑھتے بھی وہ ایسا کچھ نہ تھے۔ اڑھائی تین برس کے ہی تو تھے۔ اور پڑھائی ابھی ابھی شروع کی تھی انھوں نے۔ کچھ منٹ ٹیوٹر کے پاس بیٹھ کر اٹھ جاتے اور اس دوران بھی وہ باتیں زیادہ کرتے اور پڑھائی کم۔ پڑھنے کے بعد وہ کہاں چلے گئے۔ ضرور چھت پر چل دیے ہوں گے۔ کہیں سیڑھیوں میں گر ور نہ گئے ہوں۔ بیوقوف ہوگئی ہوں میں بھی۔ یہ خیال مجھے پہلے آجانا چاہیے تھا۔ بھاگی چھت کی طرف مگر چھت تو خالی تھی۔ ہوسکتا ہے نیچے والوں کے ہاں ہوں۔ پاس پڑوس والے بھی تو انھیں بہت محبت سے بلاتے ہیں۔ کبھی کسی بھیّا کی موٹر سائیکل پر چکر لگا کر آچکے ہوتے ہیں۔ کبھی کوئی دیدی اٹھالے جاتی ہے اور مجھے خبر لگنے تک یہ واقعات ہوچکے ہوتے ہیں۔ ضرور کسی کے گھر میں گھسے ہوں گے۔ ابھی پچھلے سال کی بات ہے۔ ہم کہیں اور رہتے تھے۔ سب سے نچلی منزل میں۔ رات کے کھانے کے بعد ہم سب گیٹ کے سامنے چھوٹی سی سڑک پر ٹہل رہے تھے۔ بچّے بھی باقی بچّوں کے ساتھ اِدھر اُدھر دوڑ بھاگ رہے تھے۔ کوئی پڑوسی راستے میں مل جائے تو کچھ پل رک کر بات چیت کی جاتی پھر آگے بڑھا جاتا۔ گھومتے گھامتے جب کچھ زیادہ ہی دیر ہوگئی تو سب لوگ گھروں کو لوٹ آئے۔ دیر کل کے اتوار کی وجہ سے ہوئی ورنہ سیر اس سے پہلے ختم ہوجایا کرتی ہے۔ میں نے بچّوں کو ان کے کمرے میں لٹایا اور باہر کا دروازہ بند کرنے جانے ہی والی تھی کہ میرے میاں نے پانی کا گلاس مانگا۔ انھیں پانی پلاکر دروازہ بند کرکے میں اندر آگئی۔ بچّوں کے کمرے پر نظر پڑی۔ کیسی بھلکڑ ہوں میں بھی۔ ان کی بجلی تو میں نے بند ہی نہیں کی تھی۔ اندر داخل ہوئی گل میاں کو غائب پایا۔ ابھی ابھی تو میں انھیں لٹاکر گئی تھی۔ اتنی دیر میں کیا ہوئے۔ مسہری کے نیچے دیکھا کہیں چھپنے کا موڈ نہ آگیا

ہو، وہاں بھی نہیں تھے۔ ضرور جب میں باہر کا دروازہ بند کرنے گئی تھی، یہ اپنے ابّو کے بستر میں گھس گئے ہوں گے۔ یہ سوچ کر اپنی خواب گاہ میں آئی۔ مگر وہ وہاں بھی نہیں تھے۔ ان کے ابّو کی آنکھ لگ گئی تھی۔ ایک لمحہ ایسے ہی کھڑی میں دم بخود سوچتی رہ گئی۔ پھر سارے گھر میں ڈھونڈا۔ ہر کمرہ، باورچی خانہ، غسل خانہ، سٹور، کہیں بھی نہ تھے۔ حیران و پریشان گیٹ کھول کر باہر آگئی، اِدھر اُدھر دیکھا۔ ساتھ والے گھر کی گھنٹی بجائی۔ مگر وہ شاید سو چکے تھے۔ پھر سامنے گلی میں نظر دوڑائی۔ سوچا ایک بار تلاش کر لوں پھر ان کے ابّو کو جگا دوں گی۔ گلی، کھمبے پر لگی برقی نلی سے روشن تھی۔ اور دور دور تک کوئی بھی نظر نہ آرہا تھا۔ پریشانی اور فکر سے میرے کانوں سے شعلے نکلنے لگے۔ دل اور جگر کے درمیان ہوک سی اٹھنے لگی۔ مگر میں تکلیف میں بھی عقل کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ اور آخری حد تک امید کا آنچل وسوسوں کے وجود پر اوڑھے رکھتی ہوں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا مجھے کہ شاید کہیں آس پاس ہی ہوں گے۔ مگر ارد گرد تعمیر کا کام بھی تو بہت ہو رہا تھا۔ کہیں خدا نخواستہ کوئی مزدور وزدور نہ اٹھا کر لے گیا ہو۔ یہ لوگ جرائم پیشہ بھی تو ہوا کرتے ہیں کبھی کبھی۔ مگر آخر گلّ باہر کب نکلے ہوں گے۔ پھر اندر بھی تو نہیں تھے۔ گلی میں دو تین گھر اور بھی تھے جن سے ہمارا ملنا ہوتا تھا۔ وہاں جانے سے پہلے میں نے اپنے گھر کی دوسری طرف والے مکان کی گھنٹی بجائی۔ ہو سکتا ہے وہاں چلے گئے ہوں۔ وہاں ان کے دو تھوڑے بڑے بچّے بھی ہیں جو گلّ کو باری باری اٹھانے کے لیے ایک دوسرے کے پیچھے لگے رہتے ہیں۔ گھنٹی کی آواز سن کر ان کی ممی باہر آئیں۔ میں نے انھیں ساری بات بتائی۔ وہ بھی سن کر چپ سی ہو گئیں۔ بولیں "یہاں تو نہیں آئے"۔ میں گلی کی طرف مڑ گئی۔ پڑوسن مجھے جاتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔ میرا دل کچھ زور سے دھڑکنے لگا۔ کہاں چلا گیا میرا گلّ۔ ساری کالونی COLONY کا لاڈلا۔ سب سے خوب صورت، پیارا سا، بھولا سا، سب سے مانوس۔ وہ کھو گیا تو ہر آنکھ روئے گی کہ سب اس کے دیوانے تھے۔ کوئی اس کی توتلی باتوں کا۔ کوئی اس کے نرم نرم گالوں کا۔ من موہنی صورت کا۔ گول مٹول ننھے منے وجود کا۔ میں اتنی اہم اسی لیے تو تھی کہ میں گلّ کی امّی تھی۔ مجھے اس سارے ایریے میں اتنی محبت اور اہمیت گلّ کی ہی وجہ سے تو مل رہی تھی اور میری دنیا کو گلّ نے ہی تو مکمل کیا تھا۔

ورنہ گڑیا کو پاکر میں بے حد مسرور اور شاداں تو تھی مگر جب وہ بڑی ہوگئی اور کچھ اکیلی سی بھی تو مجھے بھی خالی خالی سا لگنے لگا۔ کچھ ہمارے میاں کی خواہش کچھ ان کے رشتہ داروں کے تقاضے اور کچھ مالکِ دوجہاں کی مہربانیاں کہ گل کھل اٹھے میرے گھر آنگن میں۔ میری ممتا کی تکمیل تھے وہ۔ میرے خوابوں کی تعبیر تھے وہ۔ میرے سب کچھ تھے وہ کہ میری اولاد تھے وہ — جانے کیا کیا سوچتی ہوئی میں گلی میں واقع پہلے دروازے پر دستک دینے ہی والی تھی کہ پڑوسن نے پیچھے سے آواز لگائی۔ مسکراتے ہوئے بولیں کہ آپ تو سچ مچ ہی پریشان ہوگئیں۔ آجایئے۔ یہیں ہے۔ میں مذاق کر رہی تھی۔ جاتی ہوئی جان لوٹ آئی مجھ میں۔ اور میں دیوانوں کی طرح ہنس دی۔ وہ بولیں ہم بستروں میں لیٹ چکے تھے کہ باہر کی گھنٹی بجی۔ بس ایک بار۔ چھوٹی سی گھنٹی۔ میں باہر آئی۔ ادھر اُدھر دیکھا۔ کوئی نہ تھا۔ نیچے کو دیکھنے کا تو خیال ہی نہ آیا۔ جانے کو پلٹی تو ایک ننھی سی مانوس آواز میں کسی نے پکارا۔ دیکھا تو گل میاں باہر کھڑے ہیں۔ میں نے گیٹ کا تالا کھولا اور انھیں اندر لے آئی۔ بچّوں کے کمرے میں گئے اور انھیں سویا دیکھ ہمارے کمرے میں آکر ہمارے بستر میں گھس گئے۔ میں پڑوسن کے ساتھ اندر گئی تو دیکھا اس کے شوہر کے بازو پر سر رکھے لیٹے ہوئے بڑے اطمینان سے مسکرا رہے تھے۔ میں نے باہیں بڑھائیں تو اٹھ کر میری گود میں آگئے۔ جانے کیا خیال آگیا تھا چھوٹے سے دماغ میں باہر جانے کا۔ اصل میں یہ سب تب ہوا جب میں ان کے ابو کو پانی کا گلاس دینے اندر گئی۔ یہ بھی پیچھے سے باہر تشریف لے گئے تھے۔ بہر حال میں گود میں لیے واپس آئی اور اپنی طرف سے خوب سمجھایا۔ دھمکایا کہ ایسا نہیں کرتے۔ اکیلے باہر نہیں جاتے۔ چور اٹھالے جاتے ہیں بوری میں بند کر کے۔ اگر کچھ ہو جاتا تو؟ میری آنکھیں بھر آئیں اور یہ حیرت سے مجھے ایسے تکا کیے جیسے پوچھ رہے ہوں کہ بھوک لگی ہے؟ کسی نے مارا ہے کیا؟ اور منے منے ہاتھوں سے میری آنکھیں پونچھ کر میری گردن کے گرد باہیں موڑ کر لپٹ گئے مجھ سے۔ میں نے ساری رات سینے سے لگائے رکھا۔ اس رات میں نے کروٹ بھی نہیں بدلی۔ بار بار جاگ جاتی۔ ان کا ننھا سا مکھڑا چومتی۔ بال سہلاتی۔

آج بھی میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ یہیں کہیں ہوں گے۔ کہیں چھپ گئے ہوں گے۔

یہاں بھی تو وہ ساری بلڈنگ کے لاڈلے ہیں۔ سب کی آنکھوں کا تارا ہیں وہ۔ نہ ان کی صورت میں کچھ فرق آیا ہے نہ معصومیت اور تتلاہٹ میں۔ بال ضرور کچھ لمبے ہو گئے ہیں اور سر کے اوپر کسی ہیٹ کی طرح سجے رہتے ہیں۔ میں نے بھی تو ان کے بال نہ کٹوائے۔ دل ہی نہ کیا اتنے پیارے پیارے بالوں پر قینچی چلوانے کا۔ اور ہر ایک کا دوست بن جانے کی ان کی عادت بھی ویسی تھی۔ یہاں شفٹ ہونے کے دو دن کے اندر ہی سب بلڈنگ والے ان کا حال پوچھنے لگے۔ اور مجھے اس بات کی خبر لگنے تک وہ سب کے دوست ہو چکے تھے۔ اور اس میں انسان اور حیوان سب یکساں اہم تھے ان کے لیے۔ پالتو کتّے تو تھے ہی، آوارہ کتّے اور آوارہ بلّیاں بھی ان کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ مجھے یاد ہے ایک بار میں بالکنی میں کھڑی شاید پھل والے کو دیکھ رہی تھی جس کی آواز میں نے جانے کہاں سے آتی ہوئی سنی تھی ابھی وہ سامنے والی گلی سے نہیں گزرا تھا۔ سامنے والی گلی نہ تھی بلکہ اچھی خاصی کشادہ سی سڑک تھی جہاں آمنے سامنے کے گھروں کی پارکنگ تھی۔ دیکھا تو آس پاس گھومنے والا سب سے موٹا تازہ پہلوان سا کتا ہماری بلڈنگ کی سیڑھی کو گھور رہا ہے۔ میں ذرا آگے کو جھکی کہ دیکھوں تو ایسا کیا ہے وہاں۔ میں حیران رہ گئی۔ گل میاں آخری سیڑھی تک پہنچ چکے تھے۔ جانے کب وہ اندر سے نکلے۔ دو زینے کب طے کیے۔ میرا چہرہ تو باہر کی طرف تھا مگر پھر بھی پتہ تو چل ہی سکتا تھا۔ لیکن کوئی آہٹ بھی تو نہ سنی تھی میں نے ورنہ پلٹ کر تو دیکھتی۔ خیر میرے حیران ہونے سے پہلے وہ کتّے کے کافی قریب پہنچ چکے تھے اور اپنا بسکٹ والا ہاتھ اس کے منہ میں دے رہے تھے۔ میری تو جان ہی نکل گئی بھاگی ہوئی نیچے گئی کہ کہیں کاٹ ہی نہ لے۔ جب تک کتے صاحب ان کا بسکٹ کھا کر ہاتھ چاٹ کر اب ان کا منہ چاٹنے کی کوشش میں تھے اور یہ دونوں ہاتھوں سے اس کی تھوتھنی سہلا رہے تھے۔ میں متحیّر کھڑی رہ گئی۔ کچھ پل تو سمجھ میں ہی نہ آیا کہ کیا کروں۔ جی چاہا پتھر اٹھا کر کتے کے سر پر مار دوں مگر کہیں وہ میرے بچّے کو کاٹ نہ لے۔

مگر وہ اس کا دوست بھی تھا جانے کب کا۔ ظاہر ہے وفادار بھی ہوگا۔ اور پھر کتّا سب کچھ ہو سکتا ہے مگر احسان فراموش نہیں اور یہ خیال بھی مجھے نہ آیا تب۔ یہ تھر

مارنے کا خیال چھوڑ کر میں ان دونوں کے قریب چلی گئی۔ کتّا مجھے قریب آتا دیکھ کر بھاگ گیا۔ میں نے گل کا ہاتھ پکڑا نہیں بلکہ کلائی پکڑی جو کہ گندی نہیں تھی اور اوپر لے آئی بلکہ گھسیٹ لائی۔ جی چاہا ذرا زور کی ڈانٹ لگاؤں مگر اس سے بھی کیا ہونا تھا۔ ان کی ابھی اتنی عمر ہی کہاں تھی کہ سزا یاد رکھتے۔ سیدھا غسل خانے میں لے جاکر نہلایا۔ گیلے بالوں پر کنگھا کر کے بائیں طرف سے پتلی سی مانگ نکال کر بالوں کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک نظر دیکھا تو یوں محسوس ہوا کہ اتنی پیاری چیز کے ساتھ باقاعدہ عشق کیا جا سکتا ہے۔ دُھلا دھلایا مکھڑا چوم چوم کر کپڑے پہناتے ہوئے میں انھیں سمجھانے کی کوشش کرتی رہی۔ "کتّے گندے ہوتے ہیں انھیں ہاتھ نہیں لگانا چاہیے۔ بہت بری طرح کاٹتے ہیں۔ پھر بہت سے انجکشن لگتے ہیں۔" میں کہتی جا رہی تھی اور یہ اس طرح سن رہے تھے جیسے سب سمجھ رہے ہوں۔ بیچ بیچ میں ہوں، ہاں بھی کرتے جاتے اور ساتھ ساتھ اپنی قمیض کا بٹن خود لگانے کی کوشش کرتے اور یا پھر میری ناک کی لونگ پر انگلی رکھتے۔

اس واقعے کے کئی روز بعد ابھی چند دن ہی ہوئے چھوٹو انھیں گود میں لیے مُنّی کو بس سٹاپ سے لینے گیا۔ واپسی پر ان لوگوں کو کچھ زیادہ ہی دیر ہوئی تو میں پریشان ہوگئی۔ بالکنی پر کھڑی راستہ دیکھنے لگی۔ ذرا سی دیر کے بعد چلے آ رہے تھے سبھی خراماں خراماں۔ پتہ چلا بس سٹاپ سے پہلے جو پارک اس طرف کی سڑک سے ملتی ہے وہاں ایک کتیا نے بچّے دیے ہیں۔ منی نے بڑی ایکسائٹمنٹ سے بتایا۔ "ماما کتیا کے سکس (۶) پپیز (PUPPIES) ہیں۔ اتنے چھوٹے ہیں۔ آنکھیں بھی نہیں کھولتے۔ کوں کوں کرتے ہیں۔" "ان کا بِتل (بستر) ہے ہی نہیں۔" گل بھی دھیرے سے بولے۔ میں تو ڈر ہی گئی۔ "کیوں قریب لے گئے تھے بچّوں کو زچہ کتیا کے۔ کاٹ کھاتی ہے جانتے نہیں۔" میں نے چھوٹو سے کہا۔

"سبھی بچّے انھیں دیکھنے گئے۔ گڑیا بھی ضد کرنے لگیں۔ یہ بھی اچھلنے لگے کہ ہم بھی جائیں گے تو میں کیا کرتا جی۔ بڑی مشکل سے واپس لایا ہوں جی، بلکہ گل نے تو ایک بچّے کو چھوا بھی مگر کتیا صرف ہلکے سے غرائی اور کچھ بھی نہ کیا۔" چھوٹو بولا۔ میری تو جان ہی نکل گئی۔ جو کاٹ کھاتی تو۔ میں نے سب کو متنبہ کیا کہ کوئی کتّوں کے قریب نہیں جائے گا۔ گڑیا تو سن کر خاموش رہی مگر

گل نے رونا شروع کر دیا۔

"ہم آپ کو چھوٹا سا PUPPY لادیں گے۔ آپ روئیے نہیں۔ بالکل صاف ستھرا ہوگا وہ۔ سفید سفید۔ یہ تو گلیوں کے گندے کتے ہوتے ہیں۔ کتنی ہی بیماریاں ہوتی ہیں انھیں۔" میں نے سمجھاتے ہوئے کہا اور وہ چپ چاپ سننے لگے۔ اس بار شاید سمجھ گئے تھے وہ۔ دوبارہ انھوں نے نہ ضد کی نہ روئے۔ اس واقعہ کو بھی کوئی ہفتہ بھر ہونے کو آیا۔ منی کو سکول سے لاتے وقت بچّے تھوڑی دیر کے لیے پلّوں کو دور سے ہی دیکھتے اور چلے آتے۔

مگر آج کہاں چلے گئے گل۔ میں اندر سے ٹارچ اٹھالائی اور انھیں تلاش کرنے چل پڑی۔ حیران و پریشان سی۔ گلی کے دائیں بائیں روشنی پھینکتی ہوئی۔ سامنے چوڑی گلی کے دونوں کونوں سے لگی پارکوں میں نظر دوڑائی۔ ایک پارک بالکل سونی تھی۔ چوکیدار کے جھونپڑے کی بتی بھی گل تھی۔ بجلی تو تھی نہیں مگر وہ بھی شاید اندر نہ تھا کہ اس سے ہی پوچھ کر دیکھتی' دوسری پارک میں تھوڑے سے بچّے کھیل رہے تھے زیادہ تر گھروں کو جا چکے تھے۔ وہاں بھی گل نہیں تھے نہ ہی بچّوں کو کچھ علم تھا۔ لائٹ آچکی تھی۔ گل کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ اب میں باقاعدہ پریشان ہونے لگی تھی۔ مگر پھر بھی میری چھٹی حس مجھے یقین دلا رہی تھی کہ میں انھیں جلد ہی پالوں گی۔ لوٹتے ہوئے پھر دائیں بائیں نظریں دوڑاتی گئی میں۔ چوکیدار کے ہٹ میں روشنی تھی۔ ہوسکتا ہے وہ آگیا ہو۔ پارک میں داخل ہو کر میں نے ہٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا، کوئی جواب نہ ملا۔ دیکھا تو باہر کنڈے کے ساتھ چھوٹا سا تالا لٹک رہا تھا۔ واپس پلٹی ہی تھی کہ پلّوں کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دیں۔ اچھا تو یہیں کہیں دیے ہیں کتیا نے بچّے' آس پاس تو کہیں نہ تھے۔ ضرور ہٹ کے پیچھے ہوں گے۔ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھی کہیں کتیا مجھ سے خوفزدہ ہو کر کاٹنے کو نہ دوڑے۔ ٹارچ کی روشنی میں دیکھا کہ کتیا اپنے بہت سے بچّوں کو دودھ پلا رہی ہے اور ہمارے گل میاں اس کے بالکل قریب بیٹھے اس کے بچّوں پر اپنا چھوٹا سا کمبل ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور پلّے بار بار کمبل کے نیچے سے کھسک کر باہر آجاتے ہیں۔ وہ جہاں دودھ پیتے یہ وہیں کمبل ڈال دیتے۔ پلّے باہر نکل آتے اور کتیا ذرا سا سرک جاتی۔ نہ کتیا اور نہ ہی گل ایک دوسرے سے ڈر رہے تھے۔ گل اس کوشش میں تھے کہ زچہ اپنے بچّوں کو کمبل میں لے کر دودھ پلائے۔

مگر کتیا ان کی اس کوشش کی کوئی پروا نہیں کر رہی تھی۔ اور وہ گلّ کی ان حرکتوں کا برا بھی نہیں مان رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کتیا نے بھونکنا شروع کر دیا۔ اگر میں گل کو لینے جاؤں تو کتیا گھبرا کر انہی کو نہ کاٹ لے۔ حالانکہ کتّے احسان مند ہوتے ہیں۔ میں دور سے ہی گل کو آواز دینے لگی۔ "آجائیے بیٹا ٹھنڈ لگ جائے گی آپ کو۔ دیکھیے نا کتنا اندھیرا ہو گیا۔ پاپا گھر آ گئے ہوں گے"

"ماما PUPPIES کو ٹھنڈی لگ رہی ہے۔ ذرا یہ کمبل ان پر ڈال دیجیے نا۔ پلیز" (PLEASE) وہ مجھ سے مدد طلب کرنے لگے۔

"آپ آجائیے بیٹا یہ دودھ پی رہے ہیں نا جب ان کو نیند آئے گی نا تو یہ خود ہی کمبل میں گھس کر سو جائیں گے۔ یہ لیجیے آپ ٹارچ جلائیے۔" میں نے ٹارچ کو روشن کرتے ہوئے ان سے کہا۔ وہ میرے پاس آ گئے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ گلّ کے خوب صورت کمبل کو پلّے بڑی بے دردی سے روند رہے تھے۔ مگر آج صبح صبح اس عورت نے یہ کمبل اپنے مُنّے سے بچّے کے گرد نہایت احتیاط سے لپیٹا ہوا تھا۔ میرے ہونٹوں پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ پھیل گئی

○○

کانچ کے پردے

یہ گھر بہت ہی خوبصورت تھا۔ یوں بھی دلہنوں کو اپنا نیا گھر پسند آتا ہے ... آخر پیا کا گھر جو ہوتا ہے۔ اس گھر کی تمنا میں کتنے کنوارے خواب بنے گئے ہوتے ہیں۔ یہ سارے خواب سمیٹے دلہن نئے گھر میں، نئے ماحول میں، نئے لوگوں میں قدم رکھتی ہے۔ سب نیا نیا لگتا ہے اسے۔ اُس کا اپنا سراپا، اُس کی زندگی، اُس کی زندگی کا ساتھی۔ اور پھر وہ نئے سرے سے جینا شروع کرتی ہے۔ کچھ خوش قسمت دلہنیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو اپنی خواہش کے مطابق، نئے گھر کو نئے سرے سے ترتیب دیتی ہیں۔ میں بھی ان خوش قسمت دلہنوں میں سے ایک تھی۔ میں نے کچھ مہینوں میں ہی سارے گھر کو اپنی پسند کے مطابق سجا سنوار دیا۔ صرف ایک کمرہ ایسا تھا جسے سنوارنے کے لیے مجھے پورا ایک دن درکار تھا اور وہ تھا ان کے مطالعے کا کمرہ۔ جانے کس نے اسے اتنے بے ڈھنگے انداز میں رکھ چھوڑا تھا۔ کمرے کے دروازے کے داہنی جانب لکھنے کی میز تھی۔ جس کی کرسی پر بیٹھ کر سامنے دیوار کا سامنا ہوتا تھا۔ جبکہ دوسری طرف کھڑکیاں تھیں جو باغ میں کھلتی تھیں، جہاں سے سفیدے کے بلند پیڑوں کی چوٹیاں نظر آتی تھیں۔ جن پر اکثر پرندے چہچہاتے رہتے تھے۔ واہ! اگر میز کرسی ادھر کو موڑ کر رکھ دیے جائیں تو لکھنے پڑھنے میں لطف آجائے۔ اور پھر یہ دیو قامت بک کیس کمرے کے درمیان میں دھرا ہوا اور ساتھ میں کتابوں کی الماری۔ جانے کس بدھو نوکر کے بھونڈے پن کا نتیجہ تھا۔ ہمارے ان کو کیا۔ انھیں تو چاہیے ایک ایسی جگہ جہاں سوائے کتابوں کے اور کچھ دکھائی نہ دے۔

ایک میز ہو، ایک کرسی ہو، ایک ٹیبل لیمپ اور بس۔ پھر سامنا چاہے کھڑکی کا ہو یا دیوار کا۔ وہ وہیں لکھیں گے بھی اور پڑھیں گے۔ صرف ایک آدھ گھنٹے کے بعد انھیں ایک ایک پیالی چائے کی ملتی رہے۔ اور انگلیوں میں دبی سگریٹ سلگتی رہے۔

خیر بات مطالعے کے کمرے کی ہو رہی تھی۔ ایک دن ہمت کر کے تمام دوسرے کاموں سے فارغ ہو کر میں ویکیوم کلینر (VACUME CLEANER) سنبھالے کمرے میں گھس ہی گئی۔ اور جٹ گئی اسے درست کرنے میں۔ سب چیزیں ایسے رکھیں کہ کمرہ ایک دم چوکور اور خوب صورت نظر آنے لگا۔ بس ایک چیز آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ وہ تھا دیو قامت بک کیس جو کہ بیچ کمرے میں کھڑا تھا۔ کسی طرح اسے کھسکا کر میں دیوار تک تو لے آئی لیکن شاید فرش وہاں سے کچھ ناہموار تھا کہ بک کیس کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ ابھی اوپر آگرے گا۔ میں بھاگ کر نیچے باغیچے میں گئی اور چھوٹے چھوٹے دو چوکور پتھر اٹھا لائی، تاکہ میں ان کو بک کیس کے سامنے والے حصّے کے نیچے رکھ دوں اور وہ کچھ اوپر کو اٹھا رہے۔ یوں نہ لگے کہ اوپر گرا آرہا ہے۔ میں نے کافی کوشش کی ایک ہاتھ سے بک کیس کو اوپر اٹھانے اور دوسرے ہاتھ سے اس کے نیچے پتھر رکھنے کی مگر بیک وقت مجھ سے یہ دونوں کام نہ ہو سکے۔ تنگ آکر میں نے دونوں پتھر وہیں رکھ دیے اور ان کے آنے کا انتظار کرنے لگی کہ ان کی مدد سے یہ کام کر لوں گی۔

جب انھوں نے اپنے مطالعے کے کمرے میں قدم رکھا تو رک گئے اور کمرے میں چاروں طرف ایک نظر ڈالی۔ کمرے کو سجا سنورا دیکھ کر ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی، حیرت سے بولے۔

"ارے یہ سب آپ نے اکیلے کیسے کر لیا بھئی۔ ہماری شادی سے پہلے جب یہاں کی صفائی ہوئی تھی تو دو دو نوکروں کی مدد سے آپ کے دیور نے یہ چیزیں اِدھر اُدھر سرکائی تھیں۔ آپ نے تو کمال ہی کر دیا۔ مگر اتنی تکلیف کیوں دی خود کو۔ نوکر کو تو آجانے دیتیں۔"

میں مسکرا کر بولی "کمال میں نے نہیں کیا۔ کمال تو آپ کو کرنا ہے۔ بس ذرا سا اس بک کیس کو سامنے سے پیچھے کی طرف اٹھا دیں۔ تاکہ یہ ذرا سا اوپر کو اٹھے اور میں یہ پتھر اس کے نیچے رکھ دوں پھر اس کا توازن ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ہم؟" وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹے۔ "یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ آپ تو واللہ ... آپ

تو ہرن پر گھاس لادنے کی کوشش کرنا چاہتی ہیں۔ یہ جسمانی مشقت آپ ہم سے کروانا چاہتی ہیں، ہم لکھنے پڑھنے والے انسان، اور آپ ہیں کہ ہم سے ... ہم سے ... یعنی کہ مزدوروں کی طرح ...“

مجھے جیسے سانپ سونگھ گیا۔ کچھ نہ بولی۔ پہلے تو جھنجھلا اٹھی من ہی من۔ مگر پھر مجھے ہنسی آگئی۔ اور میں ہنستی ہوئی کچن میں چلی آئی اور دیگر کاموں میں مصروف ہوگئی۔ وقت گزرتا گیا۔ بک کیس گرا تو نہیں۔ مگر لگتا ایسا تھا جیسے کوئی جن سر جھکائے کھڑا ہو اور پوچھنے ہی والا ہو۔ ”میرے آقا کیا حکم ہے۔“

اس پر جب بھی میری نظر پڑتی تو الجھن سی ہونے لگتی۔ لیکن وہ لکھتے پڑھتے وقت بے خیالی میں جب کھڑکی کے باہر کے منظر سے لطف اندوز ہوتے تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہتی

کچھ عرصہ بعد اللہ نے میری گود بھری۔ ہمارے ہاں ایک بیٹی نے جنم لیا۔ میری مصروفیات بڑھ گئیں۔ ہمارے دانشور شوہر کو کام کرنے کے نام سے جانے کیوں گھبراہٹ ہونے لگتی کبھی میں اگر گڑیا کے پوتڑے دھو رہی ہوتی تو انھیں چائے کے انتظار میں بڑی کوفت میں بیٹھا ہوا محسوس کرتی۔ مجھے غصہ آنے لگتا۔

” اُف یہ آدمی تو اپنے لیے چائے کی ایک پیالی تک نہیں بنا سکتا۔ انتظار چاہے کتنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔“ میں اپنے آپ سے کہا کرتی۔ انھوں نے انتظار کرنا تو سیکھ لیا لیکن خود کو بدلا نہیں۔ میں نے شکر ادا کیا کہ چلو اسی بہانے ان کی اتنی زیادہ چائے نوشی کی عادت تو کم ہوئی۔ میری ہر ممکن یہی کوشش رہتی کہ کسی طرح کی پریشانی نہ ہو ان کو۔ چاہے گڑیا مجھے رات رات بھر جگائے کیوں نہ رکھتی ہو مگر ان کے چائے کے وقت سے پہلے ہی ہمیشہ اٹھ جاتی۔ اگر کبھی ذرا سی دیر ہو جاتی تو وہ سارے گھر میں اِدھر اُدھر چکر لگاتے ہوئے نظر آتے۔ سگریٹ کے دھوئیں سے فضا کو آلودہ کرتے رہتے اور منہ سے ایک لفظ نہ نکالتے۔ اس منظر سے مجھے ذہنی تکلیف ہوتی۔ میں ایسے منظر کبھی دوبارہ دیکھنا پسند نہ کرتی اور اسی وجہ سے ان کی صبح کی چائے میں کبھی دیر نہ ہونے دیتی۔

کچھ دنوں سے گڑیا کی طبیعت لگاتار خراب رہنے لگی تھی۔ کئی رات سے وہ جاگ رہی تھی۔

اور گھنٹوں روتی رہتی۔ ننھی سی جان کا تڑپنا نہ دیکھا جاتا۔ میں اسے رات بھر گود میں لیے لیے گھومتی رہتی۔ اس کے ساتھ ساتھ کبھی خود بھی رو پڑتی۔ وہ تو اکثر رات گئے تک اپنے پڑھنے کے کمرے میں گھسے رہتے۔ جب کبھی گڑیا زیادہ چیخنے لگتی تو وہ سگریٹ جھاڑتے ہوئے خواب گاہ میں داخل ہوتے اور چشمے کو ناک کی نوک پر ٹکائے مجھ سے ایسے پوچھتے جیسے میں گڑیا کو جان بوجھ کر رُلا رہی ہوں۔

"کیا ہوا گڑیا کو؟"

ان کے اس سوال میں پریشانی سے زیادہ غصہ نمایاں ہوتا۔ میرا جی چاہتا کہ کہہ دوں اسے مار پیٹ تو نہیں رہی نا۔ کوئی تکلیف ہے معصوم بے زبان کو۔ اس میں آپ کو غصہ کیوں آرہا ہے۔ لیکن زبان سے کچھ نہ بولتی۔ چپ چاپ اسے گود میں لیے ٹہلتی رہتی۔ جب وہ اس بات سے اتنے عاجز آرہے ہیں تو میری غصیلی باتیں سن کر ان کے غصے میں اور اضافہ ہو سکتا تھا ایسا کرنے سے میں نے ہمیشہ خود کو روکا ہے۔ جتنا ہو سکے میں ماحول کو پرسکون دیکھنا چاہتی ہوں۔ انھیں غصہ کسی بھی وقت آسانی سے آسکتا ہے۔ اور اگر میں اس سے فضا کو بچانے کی کوشش نہ کرتی رہوں تو گھر کی ساری ٹھنڈک میں گرم گرم ہوا کی لہریں چلنے لگیں۔ یہ وہی لہریں ہیں جو لگاتار چلتی رہیں تو گھر کی ہر شے کے ساتھ ساتھ ذہن و دل کو بھی سلگا سکتی ہیں اور آہستہ آہستہ سلگنے والی یہ آگ ایک دن پوری گرہستی کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے۔ شعلے اٹھتے ہیں اور برباد کردیتے ہیں۔ جوش میں کوئی ہوش نہیں رہتا کہ اس آگ کو کیسے بجھایا جائے۔ اور پھر سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ گھر ایک ویران کھنڈر کی مانند نظر آتا ہے ... اور ویرانوں میں زندگی کہاں۔ زندگی سے ہمیشہ محبت کی ہے میں نے۔

کئی دنوں بعد آج گڑیا کچھ بشاش لگ رہی تھی۔ میں شام سے ہی اسے سلانے کا ... بندوبست کرنے لگی تاکہ اس کی کئی دنوں کی نیند پوری ہو جائے۔ تھوڑی دیر بعد گڑیا کو نیند آگئی۔ میں نے سب کام جلدی جلدی نمٹا لیے اور فارغ ہو کر خوابگاہ میں آگئی۔ گڑیا کو دیکھتے دیکھتے جانے کب میری بھی آنکھ لگ گئی۔ وہ کب سونے کے لیے کمرے میں آئے مجھے کچھ خبر نہیں۔ معمول کے مطابق صبح وقت پر میری آنکھ بھی نہ کھلی۔ کھڑکی کے شیشوں کا کوئی لحاظ نہ کرتے ہوئے دھوپ

سیدھی میرے چہرے پر آگئی اور میں اٹھ بیٹھی۔

بھاگی بھاگی ڈرائنگ روم میں گئی تو حیران رہ گئی۔ وہ حسبِ معمول چائے پیتے ہوئے اخبار دیکھ رہے تھے۔ مجھے یقین نہ آیا۔ ٹی وی آن کرنے کے بہانے میں نے پاس سے گزرتے ہوئے پیالی میں جھانک کر دیکھا تو وہ واقعی چائے ہی پی رہے تھے۔ کمال ہے۔ یہ سب خود انھوں نے کیا۔ میں یہ ہی سوچ رہی تھی کہ انھوں نے اچانک اخبار سے سر اٹھا کر مجھے اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہے ہیں۔

" ہم بھی چائے بنا سکتے ہیں ؟"

" آپ نے کیوں ... ؟ مجھے کیوں نہیں جگایا آپ نے ۔" میں نے پوچھا۔

" آپ تھکی ہوئی تھیں۔ پھر جب آپ خود نہ جاگیں تو ہم نے سوچا کہ آپ کی نیند پوری ہونی ہی چاہیے۔" وہ کچھ نرمی سے بولے۔

" لیکن پھر بھی ... میں کچھ دیر پہلے اٹھ جاتی تو آپ کو خود ..."

" تو کیا ہوا ؟" انھوں نے میری بات کاٹ دی۔

" اس میں ایسا کیا کرنا تھا۔ اتنی آسانی سے بنتی ہے چائے یہ تو ہمیں آج پتہ چلا۔"

" شکر ہے۔ رات کو ہی برتن دھو کر سوئی تھی، ورنہ اگر انھیں چائے کی پتیلی خود دھونا پڑتی تو کیا ہوتا۔ اور اگر ایسے میں میں جاگ جاتی تو کیسے دیکھتی انھیں سنک SINK پر جھکا ہوا۔ کتنا رنج ہوتا مجھ کو۔ مشرقی بیویاں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ میں ہی تو تھی جو کچھ دن پہلے ان کی باتوں پر غصہ کیا کرتی تھی۔ اور آج جب ——————

خیر !

شاید انھیں میرے چہرے پر ندامت کے آثار نظر آرہے تھے۔

" آپ بیٹھیے ہم آپ کے لیے چائے بنا لاتے ہیں۔" وہ بولے۔ اس بات میں صداقت تھی یا طنز۔ میں شرمندہ ہو گئی۔

" ارے ارے۔ —————— ... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔"

گھبرا کر بولی اور اٹھ کر کچن میں چلی آئی۔

اس کے بعد میں ان کے وقت سے بھی پہلے چائے لے جانے لگی۔ دن میں صبح شام کسی بھی وقت۔ چاہے وہ مانگیں یا نہ مانگیں۔

کچھ وقت اور گزر گیا۔ گڑیا کچھ بڑی ہوگئی۔ ہمارے ہاں ایک بیٹا ہوا۔ میں بہت مصروف رہنے لگی۔ بچّوں کو خواہ تھوڑا ہی وقت کیوں نہ دوں مگر ان کا ٹائم ٹیبل (TIME TABLE) میں نے کبھی متاثر نہ ہونے دیا۔ انھوں نے اس دن کے بعد کبھی چائے نہیں بنائی، نہ ہی ان کے معمولات میں کبھی کوئی فرق آیا۔

منّا گھٹنوں چلنے لگا تھا۔ میں گڑیا کو اسکول جانے کے لیے تیار کر رہی تھی اس کے بس کے آنے میں بہت کم وقت رہ گیا تھا۔ جوں توں کر کے وہ تیار ہوئی اور میز پر ان کے ساتھ ناشتے کے لیے بیٹھی۔ اتنے میں دیکھا کہ منے میاں مٹّی اور دھول میں اٹے ہوئے اپنے دونوں گورے گورے ہاتھ اور گول مٹول ٹانگیں لت پت کیے ہماری طرف چلے آرہے ہیں۔ اُف میں تو پریشان ہوگئی۔ سوچا تھا اپنے ہاتھ سے گڑیا کو ناشتہ کرادوں پر یہ حضرت —— میری قمیص کا دامن پکڑا اور کھڑے ہوگئے۔ بھولی بھالی معصوم آنکھیں دیکھ کر مجھے پیار آگیا۔ میں نے گود میں لے لیا۔ سیب جیسے گالوں پر بے شمار بوسے دیتی ہوئی میں اسے غسل خانے میں لے آئی۔ ابھی میں نے اس کی صرف ایک ہی ٹانگ دھوئی تھی کہ اندر سے چھناک سے کچھ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ میں اندر بھاگنے ہی والی تھی کہ مجھے خیال آیا کہ اس معصوم کو یہاں پانی میں چھوڑ دوں؟ وہ ہیں تو سہی یہ سوچ کر میں منے کو ٹھیک سے نہلا دھلا کر باہر لے آئی اور تولیے سے اس کا جسم خشک کرنے لگی۔ گڑیا نے سوس (SAUSE) کی بوتل توڑ دی۔ وہ کرچیں چن رہے تھے۔ انھوں نے مجھے اپنی طرف دیکھتے ہوئے نہیں دیکھا میں آہستہ آہستہ منے کے ہاتھ پاؤں تولیے سے خشک کرتی رہی۔ وہ اونچی آواز سے گڑیا سے کہہ رہے تھے "سارے میں کانچ ہی کانچ بکھیر دیا آپ نے" گڑیا مزے سے میز پر بیٹھی ٹانگیں ہلا ہلا کر سینڈوچ (SAND WICH) کھا رہی تھی۔ میں نے اس طرف براہ راست نہ دیکھا۔ وہ آواز اور اونچی کر کے بولے۔

"کتنی بار کہا ہے سوس کی بوتل ہاتھ میں نہ لیا کریں آپ"۔ وہ کنکھیوں سے مجھے دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں جیسے کچھ بھی نہ جانتی تھی اس بارے میں۔ وہ بار بار کچھ نہ کچھ بولتے کہ کسی طرح میری نظر ان پر پڑے۔ لیکن میں بظاہر انجان بنی دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی۔ اندر سے ڈر بھی رہی تھی کہ کہیں کانچ کا کوئی گستاخ ٹکڑا ان کے ہاتھ میں نہ چبھ جائے۔ پھر وہ لکھ کیسے پائیں گے۔ ابھی کل ہی کتنی موٹی اور بھاری کتاب لیے لوٹے تھے۔ اور آتے ہی اسے پڑھنے بیٹھ گئے تھے۔ رات گئے تک وہ پڑھتے ہی رہے۔ لیکن اچانک رات کے تین بجے کے قریب میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ بستر پر سے غائب۔ دبے پاؤں اسٹڈی روم تک گئی تو دیکھا کہ وہ پڑھتے پڑھتے اس ضخیم کتاب کے درمیان تک پہنچ چکے تھے۔ میرے دل میں کتنی ہمدردی کتنی محبت عود کر آئی تھی اس وقت۔ انھیں وقت کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ صرف ان کی سگریٹ جاگ رہی تھی ان کے ساتھ۔

خیر بات کرچوں کی ہو رہی تھی۔ جب انھوں نے دیکھا کہ میں نے انھیں چنتے ہوئے نہیں دیکھا تو وہ اندر سے جھاڑو اٹھا لائے۔ میں خوب محظوظ ہو رہی تھی کہ کس طرح مجھے متوجہ کرتے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دیکھوں تو سہی آخر کیا کرتے ہیں۔ آج ہرن پر گھاس لاد ہی دی جائے میں نے مسکراتے ہوئے سوچا اور ویسے ہی بے خبر بنی رہی۔ اچانک ضخیم کتاب پر جھکا... سوچ میں ڈوبا ہوا ان کا چہرہ اور تھکی ہوئی آنکھیں میری نظروں میں گھوم گئیں۔ میں نے بھاگ کر ان کے ہاتھ سے جھاڑو لے لی۔

"ارے۔ کیا ہوا؟ یہ کیا کر رہے ہیں آپ ... لائیے ادھر دیجیے"۔ میں بولی۔ وہ بھی تو اسی انتظار میں تھے۔ جھاڑو میرے بڑھے ہوئے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولے "رہنے دیجیے... ہم ہی کر لیتے ہیں"۔

ناخُدا

مجھے یقین تھا کہ جب ماں واپس چلی جائیں گی تو میں پھر اکیلی پڑ جاؤں گی۔ کمزور، بے بس پھر میری وہی بے چارگی ہوگی اور وہی میرے شوہر کا رویّہ۔ وہی میرا اندھیرے میں گھر کے باہر کی سیڑھی پر انتظار کرنا اور ان کا رات کے دوسرے پہر آنا۔ وہی بے قاعدگیِ زندگی اور وہی بے وقت کا کھانا پینا۔ میرا محبت اور آس بھری نظریں لیے ان کے آگے پیچھے گھومنا اور ان کا اکڑ اکڑ کر باتیں کرنا اور میری دس دس باتوں کے جواب میں کبھی ایک بات کر لینا اور کبھی بولنا ہی نہیں۔ میرا سراپا مجبور وجود اور ان کی غرور سے تنی گردن۔

ہوائی اڈے پر جب آخری بار الوداع کہتے ہوئے میں ماں کے سینے سے لگی تو میری آنکھیں چھلک پڑیں۔ کوئی دو چار آنسو نہیں، بلکہ لڑیاں بہنے لگیں اشکوں کی۔ کوئی سیلاب آرہا ہو جیسے یا کوئی بندھ ٹوٹ گیا ہو۔ زوردار پانی کے ریلے سے کوئی دیوار ڈھے گئی ہو۔ اور میں ماں کی باہنوں میں لڑھک سی گئی۔ انھوں نے مجھے سینے سے لپٹائے رکھا۔ کیسے سنبھال لیتی تھیں ماں مجھے۔ دھان پان سی ماں، ستّر برس کی عمر۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچا سا جسم اور کمزور باہیں۔ بظاہر کوئی ایسی بات نہیں تھی ماں میں جو انھیں کسی مضبوط سہارے سے تعبیر کیا جاسکتا۔ پھر یہ کون سی طاقت تھی ان میں، جو میں ان کے قرب میں اس حد تک حاصل کرتی رہی۔ اس لاغر سے وجود سے لپٹ کر مجھ میں جینے کی خواہش کیوں ہوتی رہی۔ اتنی ہمت کہاں سے آجاتی تھی مجھ میں۔

خیر۔ اس دن ماں کو سی آف (SEE OFF) کر کے جب میرے شوہر مجھے گھر پہنچا کر باہر جانے لگے تو پھر سے میرے اندر غم و اندوہ کے سائے سے لہرانے لگے ــــ آپ واپس کیوں چلی گئیں امّاں۔ اتنی تھوڑی سی مدّت کے لیے کیوں آئیں کہ ــــ کہ میں ــــ

آپ کے آنے سے پہلے میں جس بے چارگی کے دور سے گزر رہی تھی۔ وہی دور پھر لوٹ کے آ رہا ہے ــــ بار بار دل میں ایسے ہی خیالات ابھر رہے تھے۔ مجھ پر اداسی چھاتی چلی جا رہی تھی۔ گرد و پیش میں تاریکی سی نظر آنے لگی تھی۔

ماں نے مجھے دو برس بعد دیکھا تھا تو رو پڑی تھیں حالات سے لڑ لڑ کر تھک چکی تھی ــ اپنے آپ کو بھول کر صرف اپنے غم کو ہی یاد رکھے ہوئے تھی میں۔ اب میں صرف گھر سنبھالنے والی گرہستن تھی اور ان کے بچّے کی ماں۔ اب انھیں مجھ میں کوئی دلچسپی نظر نہیں آتی تھی۔

خود جب اماں نے مجھے دیکھا تھا تو حیران رہ گئی تھیں۔ کس قدر رنجیدہ ہو گئی تھیں فقط اتنا ہی پوچھے جائیں کہ "یہ تم کو کیا ہو گیا ہے میری بچی؟ اس پیارے چہرے پر یہ کون سا چہرہ اوڑھ لیا ہے تم نے۔ بجھا بجھا سا۔ وہ خوبصورت آنکھیں۔ وہ گھنے بال۔ کیا بیمار ہو گئی تھیں تم۔ کیا اچانک ہوا یہ سب؟ یا اس شہر کا پانی تمھیں راس نہیں آیا۔ کیا ہوا آخر میری بیٹی کو؟"

میں بھی ماں کے ساتھ روتی رہی کچھ نہ کہہ سکی۔ کچھ نہ بتا سکی۔ کوئی ثبوت تو میرے پاس تھا نہیں ان کے خلاف۔ جانے کون سا زہر گھول دیا تھا انھوں نے میری رگوں میں۔ جو میرا خون سکھاتا رہتا تھا ہر وقت۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ کبھی کچھ سوچتی کبھی کچھ ــــ خود سے خود ہی سوال کرتی۔ خود ہی جواب ڈھونڈتی۔ تھک جاتی تو رونے لگتی۔ گھنٹوں پہروں۔ ــــ کچھ دن رہنے کے بعد اماں شاید سمجھ گئیں۔ ــــ

گو کہ میں نے یہ شادی اپنی مرضی سے کی تھی۔ لیکن میں گھر سے بھاگی تو نہیں تھی جو میں گھر والوں سے کچھ نہ کہتی۔ مگر بتاتی تو کس کو؟ بھائی، بھابیوں کے سنگ سمندر پار جا بسے تھے۔ بس تھیں تو یہ ایک اماں۔ جو اپنے آبائی گھر میں اکیلی رہا کرتی تھیں۔ میں انھیں یہ سب لکھ کر پریشان کیسے کر سکتی تھی۔ کیا بتاتی انھیں گھر میں ہی سنبھالتی ہوں۔ گھر کا نظام، منی کی پرورش۔ وغیرہ۔ وہ تو رات کے کسی پہر گھر آتے ہیں اور جب چاہیں چلے جاتے ہیں۔ اور آنسو۔ زندگی کے نام پہ یہی پونجی بچی ہے میرے پاس۔ میں باتیں، طعنے اور طنز

سُن سُن کر نڈھال ہو چکی ہوں۔ مجھے اس سب کی کوئی وجہ تو معلوم تھی نہیں ——
میرے کسی بھی تقاضے کا جواب۔ مجھے عجیب عجیب طعنوں سے ملتا کہ کہیں میں کوئی دوسرا سوال نہ کر بیٹھوں۔ شاید اس لیے کہ وہ اس شہر میں آزاد تھے۔ کوئی انھیں جانتا نہیں تھا۔ کوئی رشتہ دار، کوئی پرانا دوست جس کے سامنے انھیں اپنی حرکتوں پر شرمسار ہونا پڑے۔ ہر بات اپنی مرضی سے کرتے۔ اپنی خاطر کرتے۔ کہتے کہ مجھ میں ہی کمی ہے جوان کا دل گھر میں نہیں لگتا ہے۔ تو کیا مُنّی میں بھی کمی تھی۔ اور چند ہڈیوں اور کھال پر مشتمل یہ کمزور اور لاغر سی اماں جانے کیا بھانپ گئی تھیں، کیا سمجھ گئی تھیں ——
کہتی تھیں کہ کچھ دن اور وہ نہ آتیں تو میں یا تو پاگل ہو جاتی یا پھر مر جاتی۔ ماں نے ہی تو مجھے یاد دلایا کہ میری زندگی میں شوہر کی بے جا زیادتیوں کو سہنے کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ ایک منی سی جان بھی ہے جو شاید بے خیالی میں میری لاپرواہی کا شکار ہو جاتی ہے۔ ایک میرا اپنا وجود بھی ہے، جس کو میں خدا گواہ ہے کہ بھول ہی چکی تھی —————— اماں نے ہی تو مجھے زندگی کی طرف مائل کیا۔ میرے نیم مردہ وجود میں روح ڈال دی۔ ایک بار پھر مجھے جنم دیا اماں نے۔ ایک بار پھر میں زندگی کی طرف لوٹ آئی۔ ورنہ اس SLOW POISONING سے تو میں آہستہ آہستہ موت کی طرف جا رہی تھی۔ جبکہ اپنی جان گنوانا بھی دوسرے کی جان لینے کے برابر ہے۔ اور پھر میرے بعد میری مُنی سی گڑیا کا کیا ہوتا۔ اپنوں سے بچھڑ کر اپنے وطن سے بچھڑ کر۔ ایک نیا ماحول۔ ایک بد دماغ شوہر۔ یا پھر ان کا کوئی اپنا پرابلم رہا ہو، بہر حال وہ ایک نیم ظالم قسم کے انسان ہو کر رہ گئے تھے۔ اور —— میرا ڈرا ڈرا سا وجود۔ ہر وقت سکون کے لمحوں کو ترستی نظریں۔ مجھے مظلوم سا پاکر جانے کیوں وہ اور لاپرواہی کا مظاہرہ کرنے لگتے۔ غالباً وہ یہ سمجھتے تھے کہ

میرے خیال میں محبت کے سلسلہ میں مردوں کا دو طرح کا ردِ عمل ہوتا ہے۔ ایک وہ جو عورت کی محبت پاکر اسے اور محبت دیتے ہیں اور خود کو بھرپور زندگی گزارتا ہوا محسوس کرتے ہیں اس بات کو سمجھتے ہیں کہ گھر کا پورا ماحول عورت کے گرد گھومتا ہے اور اس کی ذہنی خوشی یا پریشانی کا براہِ راست اثر گھر کی ہر شے پر پڑتا رہتا ہے۔ جاندار یا بے جان۔ وہ خوش ہے تو گھر کے ہر کونے سے خوشی پھوٹتی ہے۔ سارا گھر خوبصورت اور سنورا ہوا لگتا ہے۔ بچّے

خوش اور شوہر مطمئن دکھائی دیتے ہیں۔ ورنہ ———— گھر، گھر ہی نہیں لگتا۔ اجڑے اجڑے سے چند کمروں پر مشتمل ایک کباڑ خانہ سا، جس میں ماں کی تناؤ بھری زندگی کے سائے تلے پلتے ہوئے کھوئے کھوئے سے بچے۔ گھر کے بدصورت ماحول سے چڑچڑے بچے۔

مردوں کا دوسری قسم کا ردِ عمل اس سے مخالف طرز کا ہوتا ہے۔ یعنی جب وہ جان جاتے ہیں کہ عورت انھیں چاہتی ہے تو وہ کچھ اکڑ اور غرور کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ درست ہوگا کہ ان کی حرکات و سکنات سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ ہم تو ہیں ہی اس قدر مکمل شخصیت کے مالک کہ ہم سے کوئی بھی محبت کر سکتا ہے۔

دوسری قسم کے مردوں میں سے تھے وہ۔ عام الفاظ میں کہا جائے تو وہ میرا حد سے زیادہ CONCERN دیکھ کر سر چڑھ گئے تھے۔ شاید وہ یہ سمجھتے تھے کہ اپنے رویے سے وہ مجھے دبا ہوا رکھنے میں کامیاب ہیں۔ ورنہ دوسری صورت میں اگر میں بھی گھر سے باہر جانے لگوں تو انھیں بھی گھر کی تنہائی بانٹنا پڑے گی۔ ان کا خیال شاید یہ تھا کہ ان کے رعب و دبدبے کی وجہ سے میں نے پڑھنا لکھنا ترک کر دیا ہے۔ نہ تو یونی ورسٹی جاتی نہ ہی لائبریری۔ حالانکہ وجہ یہ نہیں تھی۔ وجہ میرے دل کی مستقل اداسی تھی جس نے میرے اندر سے زندہ رہنے تک کی آرزو کم کر دی تھی۔ پڑھنے کے شوق کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

آخر میں نے یہ طے کر لیا کہ ان حالات سے نجات پانے کے لیے مجھے کچھ کرنا چاہیے۔ سب سے پہلے انھیں یہ احساس دلایا جائے کہ میں اس قدر ان کے رحم و کرم پر نہیں ہوں جتنا کہ وہ سمجھتے ہیں اور نہ ہی وہ خود اتنے اہم ہیں جتنا کہ وہ ظاہر کرنے کے درپے رہتے ہیں بلکہ میں بھی ان کے اور گھر کے لیے اتنی اہم ہوں جتنا کہ وہ خود۔ ایم۔ اے کے بعد میں پی ایچ ڈی (P.H.D) کرنا چاہتی تھی لیکن اس ذکر پر وہ ہمیشہ جھگڑا شروع کر دیا کرتے تھے

"آپ یہ چاہتی ہیں کہ ہم گھر میں بچے کھلائیں اور آپ باہر جائیں۔ یہ سب بھول جائیے اب۔ یا تو شادی کرنا تھی یا پھر کیریئر بنانا تھا۔ اب دو دو کام تو ہونے سے رہے۔"

اور میں لاجواب ہو جاتی۔

کیا ایسے ہی میری زندگی کی ہر خوشی اور تمنا تمھاری خواہشات پر قربان ہوتے ہوتے ختم ہو جائے گی؟ اونچی تعلیم حاصل کرنے کا میرا خواب ادھورا رہ جائے گا؟

کیا شادی کر کے لڑکیوں کا کیریئر
ختم ہو جاتا ہے۔ جب کہ مرد دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلا سکتا ہے تو کیا عورت گھر اور کیریئر
ساتھ نہیں چلا سکتی۔ ہوتا تو ہے ایسا تو پھر میرے ساتھ یہ ظلم کیوں۔ لیکن میں نے ان سے
ایسا کچھ نہ کہا۔ نہ ہی وہ اور زیادہ دن ایسا کر پائے۔ ——— امّی
کے جلال کے سامنے وہ آہستہ آہستہ اپنی حرکات و سکنات میں احتیاط برتنے لگے۔ ان کی
پاکیزہ اور پروقار شخصیت کا رعب تھا یا ان کے ساتھ ان کے بزرگانہ رشتے کا احترام کہ وہ
کچھ کچھ صحیح وقت پر آنے جانے لگے۔ گھر کے ماحول کا تناؤ اور کھچاؤ کچھ کم ہونے لگا۔ ان کی غرور
سے اکڑی ہوئی گردن میں کچھ جھکاؤ سا آگیا۔ اور میرے دماغ کی تنی ہوئی نسیں معمول کی شکل
اختیار کرنے لگیں۔ اور آہستہ آہستہ امّی نے مجھے موت کے اس اندھے کنویں سے کھینچ نکالا
جس کی کوئی تہہ ہی نہ تھی۔ اور میں جانے کہاں گرتی چلی جا رہی تھی۔ اور گرنے کا یہ عمل کتنا
طویل تھا کون جانے۔ اماں نے دھیرے دھیرے مجھے میری دلچسپیوں کی طرف راغب کیا۔
میرے گھریلو کاموں میں ہاتھ بٹا کر مجھے اتنا وقت دیا کہ میں اپنے مستقبل کے بارے میں
سوچ سکوں۔ اپنے آپ کو اہمیت دوں۔ اور آہستہ آہستہ میں سچ مچ کچھ نارمل سی ہونے
لگی۔ میں نے ایم فل میں داخلہ لے لیا۔ لائبریریز جانے لگی۔ پھر سے باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ
شروع کر دیا میں نے۔ اور اس دلچسپی کی طرف لوٹ آنے کے بعد مجھے اپنے آپ میں دلچسپی
پیدا ہو گئی۔ میں نے اپنی صحت کی طرف دھیان دینا شروع کیا۔

ماں تین مہینے یہاں رہیں۔ ان تین مہینوں میں، میں نے جیسے جنت پالی ہو۔ اتنے
بھرپور جیسے میں نے یہ تین مہینے کہ پچھلے دو سال کی ساری کلفتیں دور ہو گئیں ذہن سے۔ اماں
میرے اور غموں کے درمیان مضبوط قلعہ کی مانند کھڑی رہیں۔ میرے بال پھر سے گھنے ہو گئے۔
آنکھوں کی چمک لوٹ آئی اور آج جب انھیں رخصت کر کے میں گھر آئی تو روتے روتے
میری نظر آئینے پر پڑی۔ میں واقعی پہلے جیسی خوب صورت لگ رہی تھی۔ لیکن آنکھوں سے
رواں آنسوؤں کو دیکھ کر مجھے وہ پہلے کی بے بسی اور بجھی ہوئی "میں" یاد آنے لگی اور اسی لمحے
میرے شوہر نے اعلان کر دیا کہ وہ باہر جا رہے ہیں اور رات کو دیر سے لوٹیں گے۔ میرے سر
پر جیسے کسی نے ہتھوڑے سے وار کر دیا ہو۔ میرے دل کے اندر درد کی ایک اندوہ ناک

لہرا اٹھی اور مجھے اپنا آپ پیڑ سے کاٹی گئی ہری ڈالی کی طرح نظر آنے لگا۔ میں نہایت بے چارگی کے ساتھ ان کی طرف دیکھنے لگی۔ اور ایک شکست کا احساس مجھ پر طاری ہوگیا۔ میری ٹانگوں میں تھرتھری پیدا ہوگئی اور اس سے پہلے کہ میں ہمیشہ کی طرح دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہو جاتی اور بے بسی سے اس لاپروا انسان کو جاتا دیکھتی اور خاموشی کا زہر پی کر تھکی تھکی سی کچھ دیر بعد وہاں سے ہٹ جاتی کہ ——— دو ضعیف اور کمزور باہوں نے مجھے پیچھے سے تھام لیا ——— میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ سرد پڑتے ہوئے ہاتھ پیروں میں اچانک حرارت سی دوڑنے لگی اور جانے کہاں سے ہمت اور جوش و جلال کا ایک دریا سا میرے اندر موجزن ہوا۔ میں جذبات کے طوفان پر قابو رکھتے ہوئے نارمل سے لہجے میں بولی،

"آج مجھے بہت سے کام کرنے ہیں جاکر۔ اس لیے آج آپ گھر پر رہیے۔ پہلے میں ہو آتی ہوں۔"

آج سے پہلے اگر ہم دونوں باہر ہوتے تو امی گھر پر تھیں منّی کے پاس۔ مگر آج حالات دوسرے تھے۔ انھیں شاید مجھ سے اس جواب کی توقع نہ تھی وہ سمجھتے تھے کہ شاید ——— ان کی حکمرانی شروع ہو جائے گی۔ اور میں خود بھی تو ایسا ہی سمجھتی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ آج مجھ میں زندگی جینے کی بھرپور خواہش تھی۔ میں ان کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی جس پر کئی رنگ آئے اور آخر کار سرخ ہوتا ہوا ان کا چہرہ نارمل ہوگیا اور تحکمانہ انداز بدل کر دوستانہ ہوگیا اور وہ بولے، "آیئے مل کر TIE UP کر لیتے ہیں۔"

ایک تھکی ہوئی شام

تیز برقی روشنیوں سے ذرا دور ایک طرف کو وہ چھوٹا سا بچہ اپنی کمزور سی، تھکی ہوئی سی ماں کے پیچھے کچھ اس طرح سے بیٹھا تھا کہ میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ بیٹھا ہے یا اوندھا لیٹا ہے۔ نہ ہی میں یہ طے کر سکی کہ وہ کوئی شیر خوار بچہ ہے یا کوئی تین چار سالہ بچہ۔ وہ کسی تنہا پرندے کی طرح اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے آہستہ آہستہ کبھی یہاں دیکھتا کبھی وہاں۔ اس نے اپنے مختصر سے وجود کو ایسے سمیٹ رکھا تھا کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ چل سکتا تھا یا بیٹھ بھی سکتا تھا یا نہیں۔ اس کا اوپر کا دھڑ آگے کو جھکا ہوا تھا اور اس کی قمیض ڈھیلی سی تھی۔ پتہ نہیں اس کی ٹانگیں تھیں بھی کہ نہیں۔ اس کا ایک ہاتھ اپنی ماں کی پیٹھ پر تھا جس کی ریڑھ کی ہڈی گردن سے اخیر تک یوں ابھری ہوئی تھی جیسے کوئی بڑا سا کنکھجورا ہو۔ اس کے سامنے ایک میلی سی چادر پر رنگ برنگی چھوٹی چھوٹی گیندیں سجی ہوئی تھیں۔ اور وہ سب آنے جانے والوں کو اپنی نحیف سی آواز میں اپنی مختصر سی دکان کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں تقریباً بیس منٹ سے یہاں کھڑی تھی۔ اسی دوران اس بھیڑ بھاڑ والے ماحول میں جہاں قرب و جوار کے لوگ ہر روز اس "اپّو گھر" کو دیکھنے آتے اور جو بچوں کی پسندیدہ جگہ تھی، صرف ایک بچے نے اس بال کو پسند کیا تھا اور اس کی ممی نے اسے وہ لے دیا تھا۔ باقی لوگ پاس سے گزر جاتے یا کچھ اور خرید۔ تے۔ لوگ تو اندر جانے کے لیے آتے تھے۔ اندر میلے کا سماں ہوتا تو باہر کیوں رکتے۔ اس کالی سی مریل عورت کی اتنی حیثیت ہی کہاں تھی کہ وہ اندر جا کر کچھ بیچ پاتی۔ اس کے پاس اتنے پیسے

بھی نہیں تھے کہ وہ ٹکٹ خریدتی اور اس کی میلی کچیلی چادر کو وہاں بچھانے ہی کون دیتا۔ وہاں تو بڑی دکانیں سجی تھیں جو کئی کئی لوگ چلاتے تھے جن کی بہت بکری تھی۔ یہ تنہا عورت کیوں کر یہ سب کرپاتی۔ میں وہاں بیس۲ منٹ سے کھڑی تھی اور وہ مریل سا بچّہ اپنے ننھے سے ہاتھ سے اپنی ماں کی پیٹھ ٹٹول رہا تھا۔ کن کھجورے جیسی ہڈّی کے دائیں اور بائیں بڑی نقاہت بھری آہستگی سے ہاتھ گھما رہا تھا۔ معصوم سے بے چین چہرے پر بیچارگی چھائی ہوئی تھی۔ شاید وہ ماں کی گود میں بیٹھنا چاہتا تھا یا پھر ان گیندوں سے کھیلنا چاہتا تھا۔ مگر اس کی ماں اس سے بالکل لاتعلق اپنے کھلونوں کے بارے میں ہانک لگارہی تھی وہ اپنے سے بھی زیادہ خستہ حال اپنے بچّے کو کیسے سامنے بٹھاتی کہ یہ شوکیس میں سجے گڈے گڑیوں جیسے بچّوں کی سجی سنوری مائیں بھلا اس میلے کچیلے بچّے کے ہاتھوں کے چھوئے کھلونے کیوں کر اپنے بچّوں کو خرید کر دیتیں۔ اور وہ ان کی خوشنودی کے لیے اپنے بچّے کو کسی عیب کی طرح اپنے پیچھے چھپائے ہوئے تھی۔ وہ بار بار اپنے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجائے ایک ایک گیند دھیرے سے اچھالتی تب تک جب تک کوئی سامنے سے گزر رہا ہوتا اور جب سامنے سے جانے والا گیٹ پر پہنچ جاتا تو اس کے چہرے سے مسکراہٹ ایسے غائب ہو جاتی جیسے ماضی قریب میں وہ کبھی مسکرائی ہی نہ ہو۔ وہ بچّہ اس کی پیٹھ پر کیا تلاش کر رہا تھا جو بار بار چھوٹا سا کمزور ہاتھ گھمائے جا رہا تھا۔ شاید ماں کا ہاتھ یا گود یا دودھ —— اب اس کے چہرے پر محرومی اور جھنجھلاہٹ کے تاثرات شدّت سے نظر آرہے تھے۔ میرے ہاتھ میں اندر داخل ہونے کے چار ٹکٹ تھے۔ میرے شوہر گاڑی پارکنگ میں کہیں ADJUST کر کے اب لوٹ رہے تھے۔ انھوں نے دونوں ہاتھوں سے ہمارے دونوں بچّوں کی انگلیاں تھام رکھی تھیں۔ میرا سات سالہ بیٹا اپنی عمر سے کچھ زیادہ ہی بلند قامت اور تندرست تھا اور میری چھوٹی سی تین سالہ بچّی مکھن کے پیڑے جیسی گول مٹول اور گوری تھی۔ وہ سب نظریں گھما گھما کر مجھے تلاش کر رہے تھے اور میں اس گیند والی کے پاس کھڑی عجیب سے احساسات میں گھری اس مریل سے بچّے میں کھوئی ہوئی تھی۔ کیا وہ اٹھ نہیں سکتا۔ آخر کتنی دیر سے وہ اپنی ماں کے پیچھے اس طرح پھنکا ہوا پڑا ہے۔ وہ اس قدر کمزور اور نحیف کیوں دکھائی دے رہا ہے۔ کیا اس کی ٹانگیں کام نہیں کرتیں۔ کہیں وہ پولیو زدہ

تو نہیں ۔ کیا عمر ہوگی اس کی آخر۔ چھ ماہ ۔ جس میں بچّہ بس بیٹھ سکتا ہے ۔ کم از کم جسامت سے
تو وہ اتنا ہی لگ رہا تھا ۔ یا پھر اس طرح کے اکثر بچّوں کی طرح MALNOURISHED اور
UNDER GROWN چار پانچ سالہ بچّہ ۔ وہ چلتا تو ہوگا نا ۔ یا پھر ــــــ

میرے بچّوں نے مجھے LOCATE کر لیا تھا ۔ وہ مجھے سر کے اشارے سے بلا رہے تھے ۔
شام گہرا گئی تھی ۔ نئے ٹکٹ ISSUE ہونے بند ہو گئے تھے ۔ دو گھنٹے بعد اپّو گھر بند ہونے
والا تھا ۔ میرے بچّے اندر جانے کو بے قرار تھے ۔ وہ دونوں اپنے پاپا کے ساتھ گیٹ کے قریب میرے
منتظر تھے ۔ میری چھوٹی سی بٹیا نرم نرم ، ننھی ننھی باہیں پھیلائے مجھے بلا رہی تھی ۔ اس کی معصوم
چمکیلی آنکھوں میں اضطراب تھا ۔ وہ جلدی سے میری باہنوں میں آنا چاہتی تھی ۔ میں اس سے
نظریں چرا رہی تھی ۔ اس کے بھرے بھرے گلابی گال مجھ سے ناراضگی کی وجہ سے کچھ اور پھولے
پھولے لگ رہے تھے ۔ وہ مجھے پکار رہی تھی اور میں اسے دیکھ کر GUILTY سا FEEL
کر رہی تھی ۔ مریل سا بچّہ ابھی بھی اپنی ماں کی پیٹھ ٹٹول رہا تھا ۔ میں شرمندہ سی اسے دیکھ رہی تھی ۔
میں کسی قدر رنجیدہ اور سوگوار ہو گئی تھی ۔ میں تو دوڑتی بھاگتی زندگی سے کچھ پل چرا کر یہاں
REFRESH ہونے آئی تھی ۔ یہ مجھے کس آزردگی نے گھیر لیا تھا ۔ وہ بچّہ کسی بیمار چوزے کی
طرح اپنی تھکی گردن اِدھر اُدھر گھما رہا تھا ۔ اس کی کالی کلوٹی ماں کچھ افسردہ سی اپنے کھلونوں
کو دیکھ رہی تھی ۔ شاید اس کی آج بہت کم بِکری ہوئی تھی ۔ تماشا ختم ہونے کو تھا ۔ اس کا چہرہ
اداسی میں ڈوب چکا تھا ۔ جانے وہ اس کمرشل سی مجبور مسکراہٹ کے علاوہ کبھی سچ مچ بھی مسکراتی
ہوگی ۔ اس وقت تو اس کا چہرہ لکڑی کا لگ رہا تھا ۔ ہونٹ جیسے کہ آپس میں جڑ گئے ہوں ۔ مجھے
اس کا خاموش چہرہ ، ہڈیوں کے ہاتھ جن سے وہ کھلونے اپنی میلی سی چادر میں سمیٹ رہی تھی ۔
سب کچھ کسی اور دنیا کا لگ رہا تھا ۔ کیا وہ ہماری دنیا سے تعلق نہیں رکھتی ۔ کیا وہ ہمیشہ اپنے وجود
کے پارے کو گناہ کی طرح چھپائے پھرتی ہے ۔ کیا اپنے بچّے کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر نرم
مسکراہٹ نہیں پھیلتی ۔ اس نے گٹھری باندھ کر اپنی میلی ساڑی کے پلو کو پیچھے کی طرف پھینکا ۔
ننھا سا ہاتھ اس کی پیٹھ پر رینگتا ہوا ساڑی کے پلو تک پہنچ گیا ۔ اس نے پلو کا سرا تھام لیا اور
اس کے سہارے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا ۔ اس کی ماں گٹھری اٹھا کر کھڑی ہو گئی تھی اور

آہستہ آہستہ وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے سینے کے اندر کئی لمحوں سے رُکی ہوئی سانسیں آزاد ہوگئیں اور پھر میں نے دیکھا کہ اس نے اپنی ماں کی سوکھی لکڑی ایسی ٹانگوں کے گرد اپنی کمزور اور پتلی باہیں پیوست کر دیں۔ جب وہ اسے گود میں لینے کے لیے جھکی تو اس کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ تھی جو منّی کو دیکھتے وقت میرے لبوں پر بکھر جایا کرتی ہے۔ وہ اسی فخر، خوشی اور خود اعتمادی سے اسے دیکھ رہی تھی جس سے میں اپنے بیٹے کو دیکھا کرتی ہوں۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ ہنس رہی تھی۔ میں ــــ اپنے منتظر شوہر کے پاس چلی گئی۔ منّی کے گال کا بوسہ لیا اور گڑیا کو گود میں بھر کر سینے سے لگاتے ہوئے گیٹ کیپر کو ٹکٹ پکڑا کر اندر داخل ہوگئی ــــ مگر ــــــ؟

جالے

باورچی خانے کی کھڑکی کے شیشوں سے چھن کر جو دھوپ اندر آئی تو میں چونک سی پڑی۔ خوشگوار دھوپ کی کرنیں چائے کی اس کیتلی پر پڑیں جو میں انھیں جگانے کے لیے خواب گاہ میں لے جانے والی تھی۔ آج کئی دنوں کے بعد دھوپ کی شکل دیکھنے کو ملی تھی۔ میرے دل نے جیسے کسی انجانی سی خوشی سے انگڑائی لی۔

پچھلے تین اتوار بھی انھوں نے لگاتار فیکٹری میں گزارے تھے آج بھی اتوار تھا مگر شاید آج انھیں ڈیوٹی پر نہیں جانا تھا۔ آخر انسان ہیں کیا پورے مہینے میں ایک دن بھی چھٹی نہیں کر سکتے۔ میں اپنے آپ ہی مسکرادی اور سوچنے لگی۔ آج جھیل کے کنارے لمبی سی ڈرائیو پر جائیں گے اور سارا دن باہر ہی گزاریں گے۔ رات کا کھانا بھی باہر ہی کھائیں گے۔ ایک پل کے لیے بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوں گے۔ دسمبر کا مہینہ اور اتنی حسین دھوپ۔ بھلا روز روز کہاں نصیب ہوتی ہے۔ یہ باتیں سوچتے ہوئے جانے کب میں بیڈروم تک پہنچ گئی۔ کیسے بے سدھ سوئے ہوئے تھے وہ۔ گھنگھریالے بال ماتھے پر بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ بڑی بڑی وجیہہ آنکھیں جانے کن خوابوں میں کھوئی ہوئی تھیں۔ ہونٹ کے ایک کونے پر ہلکی سی مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ داہنے ہاتھ کی انگلیاں چھاتی کے گھنے بالوں میں الجھائے کتنے پرسکون لگ رہے تھے۔ مجھے ان پر بے تحاشا پیار آنے لگا۔ ہرگز جی نہ چاہا کہ انھیں جگاؤں اس لیے ان کی پائنتی کے قریب بیٹھ کر ان کے جاگنے کا انتظار کرنے لگی۔ کتنے معصوم

لگ رہے تھے وہ بالکل کسی بچّے کی طرح۔ میں انھیں ایک ٹک دیکھے جارہی تھی۔ جیسے پہلے کبھی دیکھا ہی نہ ہو۔ سنا ہے اگر نیند میں چھاتی پر ہاتھ دھرا رہ جائے تو انسان ڈر جاتا ہے۔ اور اگر میں نے ان کا ہاتھ ان کے سینے سے ہٹا دیا تو ان کا کوئی پیارا سا سپنا کہیں ٹوٹ نہ جائے۔ پھر میں سوچنے لگی۔ اگر پل بھر کو ڈر لگ بھی گیا تو کیا ہوا کوئی چھوٹے بچّے تو نہیں ہیں وہ ——— اور ——— اگر سپنا ٹوٹ بھی گیا تو کیا ہوا؟ کیسے کیسے خیال آرہے تھے مجھے۔ اللہ نے کیا چیز بنائی ہے عورت، کہ ساری کی ساری محبت ممتا اور وفا بھر دی ہے اس میں۔ کتنی فراخ دلی سے لٹاتی ہے وہ محبت کے اس خزانے کو یہ جانے بغیر کہ بدلے میں اسے بھی کچھ ملتا ہے یا نہیں اور اکثر اسے کچھ نہیں ملتا۔ یہ سب وہ دیکھے بھی کیوں کہ اس کی وفاؤں کا یہ بھنڈار کوئی ایسا بھنڈار تو ہے نہیں جو کبھی خالی ہو جائے۔

دراصل مرد اور عورت میں یہی تو فرق ہے کہ مرد کے پیار کی مقدار نپی تلی ہوتی ہے وہ اپنے گھر والوں سے محبت کرتا ہے تو شادی ہو جانے کے بعد اسی محبت میں سے کچھ حصّہ اپنی بیوی کو بھی دے دیتا ہے اور اولاد ہونے پر بیوی ہی کی محبت میں سے بچّوں کو بھی پیار تقسیم کر دیتا ہے۔ اس طرح ہر ایک کے حصّے میں تھوڑا تھوڑا پیار آجاتا ہے۔ کہیں زیادہ کہیں کم۔ اور عورت جب بیاہی جاتی ہے تو میکے کی محبّت اس کے دل میں اپنی جگہ پر قائم تو رہتی ہے لیکن پیا کے گھر کے لیے بھی دل میں بہت سا پیار اُمڈ آتا ہے۔ اولاد ہونے پر اس کے پیار کے خزانے میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ رشتے جتنے بڑھتے جاتے ہیں محبت بھی اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے عورت کسی کے پیار کا حصّہ چرا کر کسی اور کو نہیں دیتی وہ تو پیار کا ایک ایسا خزانہ ہے جو کتنا بھی صرف ہو خالی نہیں ہوتا۔ عورت کی محبّت جمع ہوتی رہتی ہے اور مرد کی محبت تقسیم

محبتیں لٹانے اور سمیٹنے والا یہ دل کبھی کسی کی ذرا سی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتا۔

دل نہیں مانا کہ وہ نیند میں ڈر جائیں۔ میں ان کا ہاتھ ان کے سینے سے ہٹانے کے لیے جھکی ہی تھی کہ انھوں نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک مانوس سی مسکراہٹ سے مجھے دیکھا اور پھر نتھنے پھلا کر لمبی سی سانس لی۔ چائے کی مہک سے وہ انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھے۔ اور چائے پیتے ہوئے جانے کیا کیا سوچنے لگے۔

" آج تو نہیں جانا ہے فیکٹری ؟" میں نے یونہی پوچھ لیا جب کہ مجھے یقین تھا کہ وہ آج نہیں جائیں گے ۔ خلافِ توقع جب انھوں نے "ہاں جانا ہے" کہا تو میں بجھ سی گئی ۔

" کیوں کیا ہر اتوار کو ..." میں نے پوچھنا چاہا ۔ انھوں نے میری بات کاٹ دی ۔ نہایت محبت سے میرا کندھا پکڑ کر مجھے اپنی طرف کھینچا ۔ " آپ تو جانتی ہیں کہ کتنا مصروف ہوں میں آج کل اور کتنا تھک بھی گیا ہوں ۔ آپ کی قسم جی چاہتا ہے آج سارا دن سوتا رہوں لیکن کیا کروں ۔ ادھر کام کون دیکھے گا ۔ کتنے ہی لوگوں کو اوور ٹائم پر بلایا ہے ۔ لیکن آج جلد ہی آجاؤں گا وعدہ رہا ۔ چار بجے سے بھی پہلے پھر کہیں باہر چلیں گے ۔" میں چپ رہی ۔ "ٹھیک ہے نا" وہ بولے ۔ میں بھلا کیا کہتی ایک اور پہاڑ سا دن مجھے تنہا گھر میں کاٹنا تھا ۔ اور کوئی تھا بھی تو نہیں جس سے میں گھر بیٹھے دو باتیں کر لیتی ۔ خاموشی میں کچھ وقت اور گزر گیا ۔ مجبوراً برتن سمیٹ کر اٹھ بیٹھی اور کچن میں چلی آئی ۔ نوکر چھٹی پر تھا ۔ خود ہی برتن دھونے لگی ۔ پھر سے اندر جانے کو میرا جی نہ چاہا ۔ برسوں سے ساتھ رہتے آرہے تھے ہم دونوں مگر معمولی باتوں پر بھی تلخیاں پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے ۔ یوں بھی اللہ نے عورت کو عجیب شے بنایا ہے ۔ چھوٹی سی بات پر خوش ہو جاتی ہے اور ذرا ذرا سی بات پر پریشان ہو جاتی ہے ۔ وہ مرد کی تھوڑی سی محبت کو اپنے پلو میں باندھے عمر گزار دیتی ہے ۔ اس کی ساری محبت اسی کی گھر کی چار دیواری ہی میں بند ہوتی ہے ۔ اس کے اپنے گھر میں —— گھر —— اور مجھے یاد آیا گھر کے کاری ڈور میں کئی دلوں سے کہیں کہیں جالے نمودار ہو گئے تھے ۔ آج میں انھیں ویکیوم کلینرز سے سمیٹ لوں گی ۔ آخر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے مجھے ۔ چار بجے تک تنہائی کی اذیت سے بچنے کے لیے —— میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ انھوں نے مجھے کیا دیا ۔ میں تو یہی سوچتی رہی کہ میں نے انھیں کیا نہیں دیا ۔ کیوں اتنا ایثار بھر دیا ہے اللہ نے مجھ میں جس سے میں کبھی کبھی خود بھی تنگ آجاتی ہوں ۔ اور مجھے لگتا ہے کہ دوسرا مجھے بیوقوف سمجھنے لگتا ہے ۔ شاید پاگل بھی سمجھتا ہو ۔ اور یہ مرد اتنا FOR GRANTED کیوں لے لیتے ہیں ہم لوگوں کو کہ ہم جو کچھ بھی کریں اس میں انھیں کی بھلائی پیش پیش ہو ۔ اگر وہ ہمارے لیے کچھ کرتے ہیں تو ہم اسے ان کا فرض کیوں نہیں سمجھتے ۔ ان کا احسان کیوں سمجھ لیتے ہیں ۔ وہ ہمیشہ اپنے ہی کام کو کیوں ترجیح دیتے ہیں ۔ خیر یہ تو ایک ازلی حقیقت ہے میرے سوچنے یا نہ سوچنے سے اس میں کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا ۔

ناشتہ لگاکر میں انھیں بلانے کمرے میں جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ وہ مجھے اپنے سامنے تیار کھڑے ملے۔ "اتنی خاموش سی کیوں ہیں۔" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کرسی پر بٹھاتے ہوئے بولے۔ جی چاہا کہ رو دوں اور چیخ کر کہوں کہ "خاموش نہ رہوں تو کیا کروں۔ سارا دن مجھے خاموش ہی تو رہنا ہے اکیلے۔ تنہائی میں۔" لیکن میں نے کچھ نہیں کہا۔

"دیکھیے ایک بات مانیں گی۔ آج آپ بھی میرے ساتھ فیکٹری چلیے۔ آپ کا دل بھی بہل جائے گا اور میں بھی مطمئن رہوں گا کہ آپ میرے آس پاس ہی ہیں۔" میں یکایک کھل اٹھی۔ پگلی ہوں نا۔ جھیل کے کنارے نہ سہی۔ فیکٹری میں ہی سہی۔ رہوں گی تو ان کے پاس ہی۔ کتنا خیال رکھتے ہیں میرا۔ کتنا پیار کرتے ہیں مجھ سے۔ اور میں خواہ مخواہ جانے کیا سوچنے لگ جاتی ہوں۔

"لیکن میں تو تیار بھی نہیں ہوں۔" میں نے زبان کھولی۔ "تو ٹھیک ہے آپ کچھ دیر بعد آجائیے گا۔ میں گاڑی واپس بھیج دوں گا۔"

وہ چلے گئے تو میں باتھ روم میں گھس گئی۔ نہا دھو کر ان کے پسندیدہ رنگ کا لباس پہنا۔ ہلکا سا میک اپ کیا۔ پھر باہر آکر ڈرائیور کا انتظار کرنے لگی۔ جانے کتنی دیر یوں ہی لان پر ٹہلتی رہی۔ آخر ٹہلتے ٹہلتے سڑک پر آگئی۔ خالی ٹیکسی گزرتے دیکھی تو روک لی اور فیکٹری جا پہنچی۔ سوچا اچانک پہنچ کر انھیں سرپرائز دوں گی۔ دبے پاؤں ان کے کمرے کے قریب پہنچی تو چپراسی نے جلدی سے راستہ چھوڑ دیا۔

دروازے کے ایک طرف ان کی میز تھی اور دوسری طرف صوفہ۔ بچھا ہوا تھا ملنے والوں کے لیے۔ صوفے پر ایک معمولی شکل وصورت کی مگر اسمارٹ سی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی گود میں کچھ موٹی موٹی کتابیں تھیں۔ اس نے مجھے اندر آتے دیکھا تو سر کی جنبش سے مجھے آداب کیا۔ میں جونہی اندر آئی تو وہ کھڑے ہوگئے اور حیران سے ہو کر پوچھنے لگے۔

"آپ —— کیسے آئیں —— ڈرائیور تو ایرپورٹ گیا ہوا ہے۔"

"ٹیکسی سے آگئی۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ وہ کھڑے کھڑے کونے میں رکھی آہنی الماری تک گئے۔ اور جلدی سے اسے مقفل کر کے چابی جیب میں رکھتے ہوئے اپنی کرسی پر آبیٹھے۔ مجھے یہ سب عجیب سا لگ رہا تھا۔ دل میں سو طرح کے خیال آرہے تھے۔ کیا مجھے دیکھ کر وہ خوش نہیں ہوئے۔ الماری میں کیا ہے جو اسے بند کرنے میں انھوں نے اتنی پھرتی دکھائی۔ ہوسکتا ہے

میرے آنے سے پہلے ہی وہ ایسا کرنے والے ہوں لیکن پھر بھی کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ مجھ سے چھپا کر اس الماری میں کچھ رکھتے ہوں۔ کیا ہو سکتا ہے اس الماری میں جو وہ مجھ سے چھپانا چاہتے تھے۔ اور یہ لڑکی ——— ؟ یہ کیسے جانتی ہے کہ میں کون ہوں۔ ہو سکتا ہے اس نے میرے بارے میں اندازہ لگا لیا ہو۔ اور اسی لیے مجھے آداب کیا ہو۔ یا پھر ——— پھر؟ جانے کیا جاننا چاہتی تھی میں۔ ——————— "اب میں جاؤں؟" اچانک وہ لڑکی بولی۔

"ہاں اب آپ جائیے" وہ اٹھ کر چلی گئی تو وہ اسے جاتا ہوا دیکھتے رہے۔ وہ جا چکی تب بھی وہ ادھر ہی دیکھتے رہے پھر اچانک مجھ سے بولے۔ "آپ کو کتنی پریشانی ہوئی ہوگی انتظار کرنے میں۔" معلوم نہیں وہ اس لڑکی کو دیکھ رہے تھے یا میرے بارے میں سوچ رہے تھے۔ انھوں نے ایک بار بھی میرے لباس کو نہ دیکھا۔ مجھے جانے کیوں غصّہ بھی آ رہا تھا۔

"اس الماری میں کیا ہے؟" میں نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔ خدا جانے اتنی سنجیدگی اس وقت مجھ میں کہاں سے آ گئی تھی۔ کیا سچ مچ میں ان پر شک کرنے لگی تھی۔ وہ میرے سرتاج تھے۔ آج تک ان کی کسی بات سے یہ ثابت نہیں ہوا تھا کہ ان کی زندگی میں کام کے علاوہ بھی کچھ ہو سکتا ہے۔ تو پھر میرے اس شک کی وجہ؟ کیسا شک ہے یہ۔ کیا ہے اس الماری میں آخر۔ انھوں نے اسے بند کرنے میں اتنی پھرتی کیوں دکھائی۔ میرے اندر ایک طوفان اٹھ رہا تھا جسے میرا دماغ روکنا چاہ رہا تھا لیکن دل کے بس میں نہیں تھا۔ ایک عجیب سی جنگ ہو رہی تھی ذہن و دل میں جس میں دل، دماغ پر حاوی ہوا جا رہا تھا۔ سچ مچ عورت دل سے سوچتی ہے ——————— اور شاید اس کے خیالات پر جذبات کی حکومت ہوتی ہے خواہ نتیجہ اس کے لیے نقصان دہ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن جب وہ دل کی بات مانتی ہے تو مانتی ہی چلی جاتی ہے جیسے کبھی گہری نیند میں سویا ہوا انسان، اپنے خوابوں کی دنیا میں کھویا ہوا ہر شئے میں محبت کے موتی پروتا، ہر راہ میں وفا کا نور بکھیرتا اور نور کی اس نازک لکیر کو پگڈنڈی سمجھ کر چلتا رہتا ہے اور پھر اچانک جب نیند ٹوٹتی ہے تو خواب بھی بکھر جاتے ہیں۔ نہ کہیں روشنی ہوتی ہے نہ روشن پگڈنڈی۔ عورت کے محبّت کرنے والے دل کو جب کوئی جھٹکا لگتا ہے تو سپنے اپنے آپ ہی چور چور ہو جاتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے شیشے کا کوئی چھوٹا سا گھر ہلکی سی ضرب سے ٹوٹ جاتا ہے اور جس کی کرچیں چننے میں اس کی ساری زندگی گزر جاتی

ہے۔ لیکن کانچ کے یہ ٹکڑے اس کے آنسوؤں کے موتیوں کے ساتھ ایسے گڈمڈ ہو جاتے ہیں کہ دھندلائی ہوئی آنکھوں سے نہ تو وہ آنسو ہی چن پاتی ہے نہ ہی کانچ اور زندگی کی شام ہو جاتی ہے۔ پھر کوئی گھروندا نہیں بن پاتا۔

کہیں میرا چھوٹا سا گھر بھی —— کہیں یہ کسی اور سے —— نہیں، نہیں، ایسا ممکن نہیں۔ مجھے عجیب سی خلش محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے اپنا وجود ایک ذرے کی مانند دکھائی دینے لگا تھا۔ کیا اسی لیے یہ ہر اتوار کو گھر سے باہر رہنے لگے ہیں۔ یہ لڑکی کون تھی۔ اس الماری میں کیا ہے؟ "بتائیے نا، کیا ہے اس الماری میں۔" میں نے پوچھا۔

"لیجیے خود ہی دیکھ لیجیے۔" انھوں نے چابی نکال کر میری طرف پھینکنی چاہی۔ میں نے چابی لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہ شرارت بھرے لہجے میں بولے۔ "اگر ہم نہ دکھانا چاہیں تو۔"

"تو کیا، میں ضرور دیکھوں گی۔" مجھے غصّہ آگیا "آخر کیوں۔" وہ پھر اسی لہجے میں بولے۔

"اس لیے کہ آپ کی ہر چیز پر میرا حق ہے۔ جب میں دیکھنا چاہتی ہوں تو آپ کو دکھانے میں کیا حرج ہے۔" میں نے ذرا اونچی آواز میں کہا۔

"تو ہم نہیں دکھائیں گے۔" انھیں بھی غصّہ آگیا۔ اچھا خاصا جھگڑا چھڑ چکا تھا۔ میں اُن سے کنجی چھیننے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ نہایت مضبوطی سے چابی کو مٹھی میں دبائے رہے۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے ان کا چابی والا ہاتھ پکڑ لیا۔ جانے کب انھیں میرے لمبے ناخنوں میں سے کوئی ناخن چبھ گیا اور چابی ان کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گری جسے میں نے اٹھا لیا۔ ابھی میں الماری کے پاس پہنچ بھی نہ پائی تھی کہ وہ الماری کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ میں نے ان کو اس قدر سنجیدہ پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

"میں آپ کو ہرگز یہ الماری کھولنے نہیں دوں گا۔ کیا آپ جاسوسی کرنا چاہتی ہیں میری۔ کیا سمجھتی ہیں مجھ کو بھلا۔ میری اتنی توہین —— میری —— تلاشی لینا چاہتی ہیں آپ، کیا ہو سکتا ہے اس الماری میں سوائے فیکٹری سے متعلق کاغذات کے۔"

"کچھ بھی ہو۔ لیکن مجھے دیکھنا ہے ہٹ جائیے آپ ایک طرف۔" توہین تو مجھے اپنی محسوس ہو رہی تھی۔ کوئی راز ان کا ضرور ہے اس الماری میں جو مجھ کو دکھانا نہیں چاہتے تھے اور اس سے بڑی بے عزتی ایک عورت کے لیے کیا ہو سکتی ہے کہ وہ جس کو اپنا سمجھتی آتی ہو وہ کسی اور سے

کوئی تعلق رکھتا ہو۔ کیا میں ان کے لیے ایک فضول سی شے ہو کر رہ گئی ہوں جو وہ کسی اور سے

—— نہیں، نہیں۔ اتنی ذلت مجھ سے برداشت نہیں ہو سکے گی۔ میں اپنی نظروں سے گرنا نہیں

چاہتی۔ مجھ میں تو کوئی عیب نہیں ہے۔ اور پھر میرے گھر والوں کی منتیں کی تھیں ان کی آپا نے

یہ رشتہ جوڑنے کے لیے۔ کہتے تھے کہ تم سے شادی نہیں ہوئی تو کبھی شادی نہیں کریں گے۔ اتنی

محبت سے ناطہ جوڑا تھا تو پھر آج —— یہ کیا چیز ہے جو ہمارے درمیان آ رہی ہے۔

ایسا کیسے ہو سکتا ہے — نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہوتا

تو وہ مجھے فیکٹری بلاتے ہی کیوں۔ لیکن پھر بھی مجھے اپنا شک تو دور کرنا ہی چاہیے چاہے جو بھی

اس الماری میں! اور میں دعا کرنے لگی کہ الماری میں کچھ ایسا نہ ہو جس سے میرے اعتماد کے آئینے

میں بال آجائے۔ بہر حال مجھے اس الماری کو تو دیکھنا ہی تھا۔ یہ سوچتے ہی میں نے اپنی پوری

طاقت سے انھیں الماری کے سامنے سے ہٹانا چاہا۔ وہ کسی مضبوط درخت کی مانند اپنی جگہ سے

ذرا نہ ہلے۔ میں بے بس ہو گئی۔

" ہٹ جائیے آپ سامنے سے مجھے آج جان لینا ہے کہ ایسا کیا ہے جو آپ کو چھٹی کے

دن بھی گھر سے دور رکھتا ہے۔"

" ایسا کبھی نہ ہو گا۔ ہم جان دے دیں گے مگر آپ کو اس الماری میں جھانکنے نہیں دیں گے

اس کا مطلب ہے کہ آپ کو ذرا اعتماد نہیں ہم پر۔ تو کس بھروسے پر ہم ساتھ ساتھ رہ رہے ہیں۔

کیا آپ ہمیں اتنا بھی نہیں سمجھتیں"۔ وہ بولتے رہے۔

" تو پھر اس میں حرج ہی کیا ہے مجھے دیکھ لینے دیجیے میں جان جاؤں گی کہ کچھ نہیں چھپایا

آپ نے مجھ سے آخر آپ کے اور میرے درمیان پردہ ہی کیا ہے۔ جو آپ اس بات کو اس طرح

وقار کا مسئلہ بنا رہے ہیں۔"

" اگر بنا رہا ہوں تو یونہی سہی۔ اس طرح آپ مجھ کو مجرم بنا کر میرے ساتھ ایسا سلوک نہیں

کر سکتیں۔ میں ایسا انسان نہیں ہوں"۔

ان کی آواز بھرا گئی۔ میرا دل کچھ طے نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ یہ سب صحیح کہہ رہے ہیں یا غلط۔

کچھ سوچنے سمجھنے کی طاقت جیسے سلب ہو چکی تھی میرے اندر سے۔ میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

خاموشی سے چابی میز پر رکھ کر صوفے پر آ بیٹھی۔ گھر میں ہم دونوں کچھ کھنچے کھنچے سے رہے۔ رات بھر

میں ایک پل بھی نہ سوئی۔ رہ رہ کر آہنی الماری میرے تصور میں گھوم جاتی۔ صبح کے پانچ بھی نہ بجے تھے کہ میں اٹھ بیٹھی۔ وہ تو سات بجے سے پہلے اٹھنے والے نہ تھے گہری نیند سو رہے تھے۔

مجھ پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ اس الماری میں کیا ہے۔

ان کے کوٹ کی جیب سے میں نے بریف کیس کی چابی نکالی اور بریف کیس میں سے فیکٹری کی کنجی لی، جو ان کے پاس بھی رہتی تھی اور دوسری چوکیدار کے پاس۔ اگر چوکیدار نے مجھے دیکھ لیا تو ۔ تو کیا ہوگا ۔ یہ سوچ کر میں پل بھر کو گھبرا سی گئی۔ لیکن لمحہ بھر کے بعد میری گھبراہٹ بالکل غائب ہو گئی تھی۔ دیکھ لیا تو کہہ دوں گی کہ ــــــ کہ پرس بھول گئی تھی کل۔ ٹیکسی لے کر میں سیدھی فیکٹری پہنچی وہاں کوئی نظر نہ آیا۔ میں ان کے کمرے تک آگئی۔ میز کی دراز میں سے میں نے چابی نکالی اور آہنی الماری کھول دی۔ میرا دل، میرے ہاتھ، میرا سارا وجود تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے الماری سے ابھی کوئی زہریلی ناگن نکل کر میرے اعتماد کے وجود کو ڈس لے گی، دھڑکتے دل سے میں نے الماری کے اوپر والے خانے کی چیزیں ایک ایک کر کے دیکھنا شروع کیں۔ ان کی فیکٹری کی تقریبات کی کچھ پرانی تصویریں' کچھ فائلیں۔ کچھ پرانے کاغذات۔ بہت ساری کتابیں۔ ان کے بائیو ڈاٹا کی فائل۔ کچھ نقشے وغیرہ ۔ پھر میں نے دوسرے خانے کو بھی اسی طرح کھنگالا، پھر تیسرے کو اور پھر چوتھے کو بھی۔ ساری الماری چھان ماری۔ ہر ایک خانہ دیکھ ڈالا۔ مگر کہیں مجھے کچھ نہ ملا۔ ــــــــــ میں نے اسی حالت میں الماری کو بند کیا۔ چابی میز کی دراز میں رکھی، کمرے کو مقفل کیا اور پھرتی سے باہر آگئی۔ ٹیکسی دور سڑک پر میری منتظر تھی۔ میں گھر پہنچ گئی ــ آہستہ سے گیٹ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ وہ اب بھی سوئے ہوئے تھے۔ کچن میں جا کر میں چائے بنانے لگی۔ میرے ہاتھ اب بھی کانپ رہے تھے۔ دل کی دھڑکن ابھی سنبھلی نہیں تھی۔ سارا جسم پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ میں ڈائننگ چیئر پر بیٹھ گئی۔ میز مجھے دھندلی سی دکھائی دینے لگی۔ جانے کہاں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ کر آگیا اور بازوؤں کے سہارے میز پر سر ٹکا کر میں رونے لگی۔ گرم گرم آنسوؤں سے میرے ہاتھ بھیگ گئے۔ کیوں نہ بھیگتے۔ یہی تو سزا تھی میرے بے بنیاد شک کی۔ اپنے شوہر پر شک کر کے میں نے انھیں کس قدر رنجیدہ کیا۔ شرمندگی سے میری بھیگی ہوئی آنکھیں کھل نہیں پا رہی تھیں۔ وہ میرے ہی بارے میں سوچتے رہے تھے۔ اور میں کیا کیا سوچ رہی

تھی۔ اپنی بے داغ شخصیت پر اس طرح داغ لگتے دیکھ کر ان کا گلا رُندھ گیا تھا اور میں تب بھی نہ مانی تھی۔ کیسے برداشت کرتے وہ اس بے عزتی کو جب کہ میں واضح طور پر ان پر شک کر کے ان کی الماری کی تلاشی لینا چاہتی تھی۔ میں نے آج تک کبھی کسی بات پر ان سے بحث نہیں کی تھی۔ وہ لڑکی۔ آئی ہو گی کسی کام سے۔ سمارٹ تو آج کل کی سبھی لڑکیاں ہوتی ہیں — پھر — پھر کیا ہو گیا تھا مجھے؟ یہ سوچ سوچ کر میں روتی رہی اور سوچتی رہی، سوچتی رہی اور روتی رہی۔ اپنے آپ پر اتنی شرم مجھے پہلے کبھی نہ آئی تھی۔ اللہ نے میری عزت رکھ لی۔ اگر وہ کھول ہی دیتے میرے سامنے الماری تو کس طرح نظر ملا سکتی میں ان سے۔

چائے کی کشتی لے کر میں بیڈ روم میں آ گئی۔ وہ بے خبر سوئے پڑے تھے۔ کہیں وہ جان جاتے کہ میں ان کو سوتا چھوڑ کر فیکٹری گئی تھی تو یقیناً مجھے زندگی بھر معاف نہ کرتے۔ ان کو ناراض کر دیتی میں عمر بھر کے لیے۔ اس خیال ہی سے کانپ اٹھی میں۔ میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ میں نے ان کے سینے پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ جاگ گئے۔

"مجھے معاف کر دیجیے۔" میں نے ہچکیوں کے درمیان اٹک اٹک کر الفاظ ادا کیے۔

"ارے ارے کیا ہوا۔" وہ میرا سر سہلانے لگے۔

"میں نے کل آپ کا دل بہت دکھایا مجھے معاف کر دیجیے۔" میں نے کہا۔

"پگلی۔" وہ بڑی محبت سے بولے اور اداس ہو کر کہنے لگے۔ "معافی تو مجھے مانگنی چاہیے آپ سے مجھی کو جانے کیا ہو گیا تھا۔ ناحق آپ پر بگڑ بیٹھا ورنہ آپ دیکھ لیتیں تو کیا ہو جاتا۔ آپ کو پورا حق ہے۔ لیکن وہاں جو کچھ بھی ہے فیکٹری کے ہی بارے میں ہے۔ میرا ذاتی تو کچھ بھی نہیں۔ آپ آج میرے ساتھ چلیں اور دیکھ کر تسلی کر لیں۔ ٹھیک ہے نا۔" وہ نرمی سے کہتے رہے۔

"نہیں مجھے کچھ نہیں دیکھنا ہے اور نہ ہی کچھ جاننا ہے۔ آپ بس مجھے معاف کر دیجیے۔" میری آنکھوں سے آنسو رک نہیں پا رہے تھے۔ رکتے بھی کیسے۔ انھی آنسوؤں سے تو میرے دل پر لگے شکوک کے داغوں کو دھلنا تھا آخر۔

OO

گونگی

چھوٹے صاحب نے جب اپنی کہی ہوئی بات کا ردِ عمل اس چہرے پر تلاش کیا تو وہاں کوئی تبدیلی نہ تھی۔ وہی ازل سے پُرسکون چہرہ، معصوم آنکھیں۔ جب انھوں نے پھر اپنی بات دہرائی تو وہ بس اتنا سا بولی "کیا سچ کہہ رہے ہیں آپ؟" اس کے چہرے پر ویسے ہی تاثرات تھے۔ ابروؤں کے درمیان ایک ہلکی سی عمودی لکیر کھنچ گئی تھی۔

صرف سوالیہ نشان کے طور پر۔ اور چھوٹے صاحب نے سر اثبات میں ہلا دیا۔ "تو ٹھیک ہے۔ لے آیئے۔" وہ آہستگی سے بولی۔

چھوٹے صاحب کچھ حیران سے پشیمان سے اسے تکے جا رہے تھے جو اب باورچی خانے کی طرف جا رہی تھی۔ اس کی بلند کرداری کا یہ ایک اور پہلو تھا۔ بلکہ اس کے کردار کا ہر پہلو بلند تھا۔ معصومیت میں لپٹی سادگی ــــ بہت کم بولتی ــــ ہر ایک کی سنتی۔ اس کی جٹھانیاں اس کی کم گوئی کی وجہ سے اسے گونگی کہتیں۔ وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ دو بھائیوں کے بیچ کی لاڈلی بہن۔ شریف، عزت دار، صاحب جائداد گھرانہ۔ جب چھوٹے صاحب کا رشتہ طے کرنے بڑی بھابی اور چھوٹی بھابی ان کے ہاں گئیں تو اتنا بڑا گھرانہ دیکھ کر سوچ میں پڑ گئیں، وہ بھی خاصے کھاتے پیتے گھر سے تھیں مگر جہیز کا وہ ذخیرہ نہ لا سکی تھیں جو یہاں سے آنے کی توقع تھی۔ ــــ مگر جب لڑکی کو دیکھا تو مطمئن ہو گئیں

وہ خوبصورت نہیں تھی۔ بدصورت بھی نہیں تھی۔ درمیانہ جسم درمیانہ

قد۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں مگر ناک ستواں، بال گھنگھریالے اور ضرورت سے کہیں زیادہ جنھیں اس نے ایک موٹے سے ہیئر بینڈ کی مدد سے گردن پر سمیٹ لیا تھا اور جو دیکھنے میں قالین صاف کرنے برش کی طرح سخت لگتے تھے۔ ہونٹ اتنے پتلے کہ اوپر کے ہونٹ کی جگہ صرف ایک لکیر۔ رنگ گندمی تھا۔ گوری گوری بھابیوں کو یہ سب بھا گیا۔

اس کی دوسری انگلی میں انگوٹھی پہنادی۔ ماں نے وداع کیا تو سینے سے لپٹا کر اتنا ہی کہا کہ جیسی خوش تم ہمارے پاس رہیں ویسا ہی خوش سب کو رکھنا۔

سے بچپن سے ہی اتنی محبت ملی تھی کہ اسے محرومی کا کبھی احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ اس کی زندگی پُرسکون اور آسودہ رہی تھی۔ اس سرشاری نے اس میں ہر شے کے لیے محبت بھردی تھی۔ ایک سلجھے ہوئے ٹھہرے ہوئے کردار کی مالک۔ سنجیدہ بھی اور سادہ بھی یہاں وہ چھوٹی بہو بن کر آئی تھی۔ سب سے بڑی ساسو ماں کی سگی بھتیجی تھیں اور منجھلی بھی رشتے کی بھانجی ہی تھی۔ ایک یہ ہی تھی جو دوسرے خاندان سے تھی۔

اور چھوٹے صاحب جنھوں نے گھر والوں کی پسند کو بغیر دیکھے قبول کیا تھا تینوں بھائیوں میں سب سے خوبصورت تھے۔ وجیہہ اور جاذب۔ جب انھوں نے گٹھری بنی لڑکی کا چہرہ دیکھا تو انھیں کچھ بھایا نہیں۔ خود کو ذہنی طور پر اسے قبول کرنے کی کوشش میں پلٹے ہی تھے کہ وہ نہایت سادگی سے بولی "ٹھہریئے ذرا۔ پہلے میں آپ کا چہرہ دیکھ لوں۔ کہتے ہیں اگر شوہر کا چہرہ پاؤں دیکھنے سے پہلے دیکھ لیا جائے تو کبھی جھگڑا نہیں ہوتا۔" وہ پلٹ کر اسے غور سے دیکھنے لگے۔ وہ کسی معصوم فاختہ کی طرح انھیں دیکھ رہی تھی۔ سجی سنوری سی، بھولی بھالی سی۔ ماتھے پر جھلمل کرتا ہوا جھومر سجائے۔ آنکھوں میں ڈھیر سا کاجل ڈالے ناک میں چھوٹے چھوٹے ہیرے جڑی لونگ۔

۔"یہ دیکھیئے میری مہندی۔ کتنی اچھی ہے۔" اس نے چھنکتی ہوئی کلائیاں آگے بڑھا کر بچوں کی سی معصومیت سے مٹھیاں کھول کر ان کے سامنے کردیں۔ اور انھوں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کچھ سمجھتے ہوئے دو مہندی رچے مہکتے ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپالیا۔

گھر کے لوگ پہلے تو اس کی امارت سے مرعوب ہوئے۔ پھر وہ ان پر کھلی تو اس کی شرافت سے

جانے کیسے وہ سب کے کام وقت پر کر دینا MANAGE کر لیتی
تھی۔ اسے ساس سسر سے بھی اتنی ہی محبت ملی جتنی والدین سے۔ مگر اپنی دونوں جٹھانیوں کو
وہ کبھی اپنی نہ لگی۔ اس کی خاموشی، اس کا اخلاق انھیں خواہ مخواہ اپنے لیے چیلنج نظر آتا۔ اور وہ
کسی نہ کسی طرح اسے پریشان کرنے کی کوشش میں لگی رہتیں۔ مگر وہ تھی کہ پریشان ہی نہ ہوتی۔

۔ چھوٹے صاحب بڑے بھائیوں کو بھی بہت مانتے تھے اور بھابیوں کے بھی فرمانبردار
دیور تھے کہ وہ ان کی رشتے کی بہنیں بھی تو تھیں۔
چھوٹی بہو تھیں کہ گھر بھر میں مثال بن گئی تھیں۔ چپ چاپ چلتی ہوئی، چپ چاپ سنتی
جب اس کو گود بھری تو ساتھ لگے کمرے میں بھی کسی نے
اس کی آواز نہ سنی۔ آنکھوں سے آنسو رواں، لب لہولہان اور زبان پر داتا کا نام۔ ایسے
ضبط سے اس نے درد سہا کہ ساسو ماں بڑی بہوؤں سے کہتیں کہ اس کل کی بچّی سے سیکھو۔

وہ اسے کیا دیکھتیں ہاں ایک دوسرے کی طرف ضرور —— دیکھتیں ——

منجھلی بہو کے چھوٹے بھائی کے بیاہ پر سب گئے تو اماں نے اپنے سجیلے بانکے بیٹے کی بلائیں
لیتے ہوئے بڑی بہو سے کہا۔" اسے کالا ٹیکا لگا دو کہیں نظر نہ لگے کسی کی۔" " انھیں نظر نہیں
لگے گی اماں، یہ جو ساتھ ہیں۔" منجھلی چھوٹی بہو کی طرف اشارہ کر کے بیچ میں بولی۔

۔ اور یہ سب باتیں کچھ سن کر کچھ نہ سن کر چھوٹی بہو ایسے مسکرا
رہی تھیں جیسے ان کی تعریف ہو رہی ہو کہ وہ ہنستی بہت ہی کم تھیں اور مسکراتی اکثر تھیں۔
شادی میں خاصا ہنگامہ تھا جیسے کہ اکثر ہوا کرتا ہے۔ دُلہے میاں کی ایک سالی صاحبہ
لہک لہک کر گا اور جھوم جھوم کر ناچ رہی تھیں۔ سجی سجائی —— خوشبو میں لپٹی ہوئی

بے باک سی تو تھیں، مگر نازک اور حسین بھی تھیں۔ لمبی لمبی شوخ و شریر آنکھیں نہایت متناسب جسم۔ جب آپس میں تعارف ہوا تو اتفاقاً وہ چھوٹے میاں کے ساتھ کھڑی تھیں۔ ایک رشتے کی خالہ نے چھوٹے کی بلائیں لیں تو ساتھ میں اس کی بھی دونوں کا ماتھا چوما۔ چاند سورج کی جوڑی ہے، بنی رہے، بنی رہے۔" وہ دعائیں دیتے ہوئے بولیں۔ چھوٹے میاں تو BLUSH ہو رہے تھے اور وہ محترمہ کھلکھلا کر ہنس دیں۔ اس وقت چھوٹی بہو پاس موجود نہ تھیں۔

پھر جانے کیا ہوا کہ چھوٹے میاں کا دل گھر میں کچھ کم لگنے لگا۔ آفس سے جانے کہاں چلے جاتے۔ گھر دیر سے آتے۔ سال بھر تو ایسے ہی چلا۔ پھر اگلے سال کبھی کبھی رات بھی باہر گزارنے لگے۔ چھوٹی بہو کو سوال کرنا تو آتا ہی نہیں تھا۔ ان کی طبیعت میں ویسا ہی ٹھہراؤ اور اپنا پن تھا جیسا کہ شادی کے پہلے دن۔ جس دن چھوٹے صاحب دو دن بعد آتے اس دن ایسی خاطر کرتی جیسے پتھر ڈھو کر آ رہے ہوں اور تھکن سے چور ہوں۔ جب منہ پھیر کر پڑ رہتے تو انھیں بیمار جان کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتی۔ نہ کبھی شکوہ نہ کوئی شکایت، نہ حق جتانا، نہ دعوا کرنا۔ ٹھنڈے میٹھے پانی کی ندی کی طرح پرسکون، جو بہتی تو کناروں کو سیراب کرتی۔ جدھر رُخ کرتی ہریالی بکھیر دیتی۔ دوسروں کے گناہ دھوتی، غلطیاں سمیٹتی ہوئی پیغامِ زندگی دیتی چلی جاتی۔

ادھر چھوٹی بھابی تو رازدار تھیں ہی اب بڑی بھی ہو گئیں۔ کلائمکس کی منتظر تھیں۔

"آخر کب تک خاموش رہیں گی چھوٹی بہو صاحبہ۔ اب تو ان کی اپنی ہی خاموشی ان پر گی۔ ہم بھی ضبط اور صبر دیکھیں گے۔ تب ذرا دکھائیں خاموش مسکراہٹ کی جھلک تو جانیں۔" دونوں باتیں کیا کرتیں۔

ایک دن چھوٹے میاں دو تین روز بعد گھر میں دکھائی دیے۔ چہرہ کچھ اترا ہوا۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ وہ قریب آئیں ایک نظر دیکھا اور چائے بنا لائیں، "تم سے کچھ بات کرنا تھی۔" وہ رُک رُک کر بولی۔

"جی کہیے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

"دراصل ہم نے ——— ہم نے نکاح کر لیا تھا ———" وہ چہرے کی سرخی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر بولے۔

" اچھا۔" وہ ایسے بولیں جیسے انھوں نے کہا ہو کہ باہر بارش ہو رہی ہے یا یہ کہ آج گھر میں مہمان آنے والے ہیں۔

" وہ اب گھر آنا چاہتی ہے کہتی ہے کہ اب اگر نہ لے کر گئے تو خُلع لے لے گی اور اپنے خالہ زاد بھائی سے نکاح کرلے گی۔" وہ اس کے نارمل تاثرات سے شہہ پاکر ایک دم بولے۔" تم کیا کہتی ہو پھر؟" تماش بین دروازے کے پیچھے کان دھرے ہوئے تھے۔

" تو ٹھیک ہے، لے آیئے۔" وہ آہستگی سے بولی۔" آپ جیسا مناسب جانیں۔" پھر خاموش انھیں دیکھتی رہی۔

" تمھیں برا تو نہیں لگے گا؟" انھوں نے ذلیل سا ہو کر پوچھا۔

" نہیں تو۔" اس نے جیسے تھک ہار کر کہا۔ اور چھوٹے صاحب اسے دم بخود دیکھے جارہے تھے۔ حیران پشیمان سے۔ برداشت کا اتنا مادہ، یہ غضب کا استقلال کیا کسی دوسری عورت میں ہو سکتا ہے۔ وہ اسے دیکھ کر سوچ رہے تھے اور وہ باورچی خانے کی طرف جارہی تھی۔ کچھ دیر وہ ایسے ہی سوچتے رہے۔

پھر وہ آناً فاناً اٹھے اور اسی حالت میں باہر نکل گئے۔ دونوں بھابیوں نے جلدی سے راستہ چھوڑا اور مسکرا کر ایک طرف ہوتے ہوئے دھیرے سے مبارکباد دے دی۔ اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گیراج کی طرف نکل پڑے۔ شام ڈھلے لوٹے اور سیدھے بڑی بھابی کے پاس گئے۔ وہ ان ہی کی منتظر تھیں۔" دلہن کہاں ہے" وہ اشتیاق سے بولیں۔ اور انھوں نے جیب میں پڑا ہوا بڑا سا کاغذ نکالا۔" یہ لیجیے۔

یہ چھوٹی بھابی کو دکھا دیجیے گا۔"

پھر بغیر کوئی جواب سنے وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرہ ان کے استقبال کے لیے دلہن کی طرح سجایا تھا چھوٹی بہو نے اپنے ہاتھوں سے۔ مسہری پر کلیاں بچھی تھیں ROOM REFRESHNER سے کمرہ مہک رہا تھا۔ اور وہ دھلی دھلائی سی ان کو خوش آمدید کہنے کے لیے دروازے پر منتظر تھیں۔ انھوں نے شوہر کے پیچھے دیکھا انھیں نئی دلہن نظر ہی نہیں آرہی تھی۔

کمرشل ایریا

"ردّی والا، کباڑی والا..." یہ آواز اتنی دفعہ سماعت سے ٹکرائی کہ آنکھ ہی کھل گئی۔ گھڑی دیکھی تو پانچ بجے تھے۔ رات دو بجے تک پارک میں بجنے والے ڈھول سے عاجز ہو کر خدا خدا کر کے کہیں سوئے تھے۔ مگر اس میں کباڑی والے کی کیا خطا۔ یہ تو مصروف ترین علاقہ تھا۔ اور اس طرح کے علاقوں میں رہنے کا سکھ پانا ہو تو اتنا ذرا سا تو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔ جبھی ہمارے ملنے والوں کو وہ پرانی جگہ پسند نہیں تھی۔ کیا دیسی اور کیا پردیسی۔ سب کو ہمارے اس گھر سے شکایت تھی۔ یعنی اس فاصلے سے اور راستے کی تکلیفوں سے۔ اور وہ علاقہ تھا بھی سنسان سا۔ جیسے اگر آپ دس بجے سو گئے تو صبح دس بجے تک پرندہ بھی پر نہ مارے۔ اور اگر الارم نہ لگائیں تو شاید جاگیں ہی نہیں۔ دور دور تک کہیں اِکّا دُکّا گھر دکھائی پڑتے۔ اور دُکان تین کلومیٹر کی دوری پر۔ وہ بھی صرف کریانے کی۔ تازہ سبزی لینے مخالف سمت کو دو کلومیٹر چلنا پڑتا۔ اور قصائی کوئی ۴ کلومیٹر دور۔ اگر بھولے بھٹکے کوئی سبزی کی ریڑھی آجاتی تو بس وہی بچی کھچی ذرا ذرا سی، باسی سبزیاں ہوتیں۔ اگر بس سے کہیں جانا ہے تو بس اسٹاپ پر کم سے کم ایک گھنٹہ ضرور انتظار کرنا پڑتا۔ کھینچ تان کر ہم نے دو سال وہاں گزارے۔ یہ امید بھی تھی کہ جلد ہی سارا علاقہ آباد ہو جائے گا۔ اور وہ ٹوویل پُل جو برسوں سے تعمیر ہو رہا تھا اور ہونے میں ہی نہ آتا تھا —— بھی بہت جلد تعمیر ہو جائے گا۔ مگر عالم یہ تھا کہ اگر ہمارا کوئی ملنے والا ایک دفعہ غلطی سے آگیا ہو تو آگیا ہو، دوسری بار کوئی نہیں آیا۔ کسی نے اس غلطی کو دہرانے کی جرأت نہ کی کہ ہمارے گھر کو کوئی تلاشِ بسیار کے بعد ہی ڈھونڈ پایا۔

اس لیے کہ آس پاس شاذ و نادر ہی کوئی پتہ بتانے والا ملتا۔ اور پھر اتنی دور آئے بھی کون۔ دور کے رشتے دار جو ناشتے پر پہنچنے والے ہوتے وہ بھٹکتے، ڈھونڈتے، ٹھوکریں کھاتے، بمشکل کہیں شام کی چائے کے وقت پہنچتے۔ بچّوں کا سکول اتنی دور پڑتا کہ اگر بس مِس ہوگئی تو سکول جانے کا خیال ہی چھوڑنا پڑتا۔ اس پر اس علاقے کو شہر کے بقیہ حصّے سے جوڑتا ہوا تنگ اور طویل جمنا برج۔ ایک تو لمبا دوسرے بے شمار ٹریفک HEAVY اور LIGHT دونوں۔ اگر گاڑیاں آ رہی ہیں تو جانے والوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں کہ یہ قطاریں کم سے کم ایک گھنٹے تک تو ٹوٹیں گی نہیں۔ دونوں اطراف ٹریفک سگنل کے پاس گاڑیوں کے جمگھٹے۔ اور اس دوران آپ اپنے پھیپھڑوں میں اس قدر کاربن مون آکسائڈ بھر لیں کہ آپ کو چکر آنے لگیں اور منزل پر پہنچنے کا خیال چھوڑ کر آپ کسی طرح گھر واپس جا کر آرام ہی کریں مگر ایسا بھی کہاں ممکن کہ آپ کے سامنے سے اور پیچھے سے گاڑیاں چڑھی آ رہی ہیں تو آپ نکل کیسے پائیں اور اگر پل پار نہ کریں تو شہر سے کٹ کر رہ جائیں۔ لوگ یہ کہیں کہ اتنی دور اس لیے جا بسے کہ کوئی ملنے نہ آئے۔ آخر کار دوستوں کے طعنے سن سن کر اور خود کچھ تنگ آ کر ہم نے گھر تلاش کرنا شروع کیا۔ طے یہ ہوا کہ اب ہم ایسے علاقے میں رہنے جائیں گے جو بارونق ہو۔ جہاں اگر مہمان اچانک آ جائے تو بغل کے ہوٹل سے کھانا منگوایا جائے۔ جہاں ریلوے سٹیشن قریب ہو۔ سینما ہال بھی دور نہ ہو اور بازار کی تمام سہولتیں میسر ہوں ہمیں اس طرح کے علاقے کی تلاش میں جہاں یہ تمام سہولتیں دستیاب ہوں، ایک سال اور لگ گیا اور اب تو ہمارے میاں حضور بھی دیر سے آنے لگے تھے۔ وجہ کوئی بھی رہی ہو، جواز معقول تھا۔ کہتے کہ بھئی ہم سے یہ دھواں نہیں پیا جاتا۔ تمام راستہ پل پار کرتے کرتے فسٹ گیئر میں گاڑی چلا چلا کر اور دس دس منٹ بعد ایک ایک انچ آگے بڑھ کر عاجز ہو گئے۔ بہتر ہے کہ ہم ۹ بجے تک اسی طرف رہا کریں۔ اور بعد میں جب ٹریفک کا زور کچھ کم ہو تب ہی رفتار ذرا تیز ہو سکتی گاڑی کی۔ یہ سن کر ہم نے ذرا زیادہ تن دہی سے گھر کی تلاش شروع کر دی۔ آخر کار بسیار دھکے کھانے کے بعد ہم اس طرح کے ایک علاقے میں گھر تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ گو کہ اب ہمیں GROUND FLOOR کے بجائے تیسری منزل پر رہنا تھا۔ چلیے کوئی بات نہیں۔ چڑھنے اترنے میں ورزش ہو گی اور یہ مکان تھا بھی

لبِ سڑک ۔ سامنے ریلوے پھاٹک ۔ قریب ہی STATION پیچھے سینما ہال ۔ ہوٹل کچھ دور تھا مگر تین چار ڈھابے گھر کی داہنی جانب اور بائیں جانب ایک پارک جس میں ہر دوسرے دن نئے نئے رنگوں کے خیمے دیکھنے کو ملتے ۔ یہاں آئے تو مارے خوشی کے پھولے نہیں سمائے ۔ اور اس دن تو ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی جب ہمارے چند دوست رات کے کوئی دس بجے گھومتے گھامتے ملنے آئے اور ہم نے انھیں کھانے کے لیے روک کر پاس کے ڈھابے سے روسٹڈ چکن اور دال منگوائی ۔ ہمارے عزیزوں کو SHIFT کرنے کا علم ہوا تو مبارکبادی کے فون آنے لگے ، سب رشتہ دار ہم سے خوش ۔ سینما شو ختم ہوتا تو لوگوں کے ہجوم سڑک پر نظر آتے ۔ ہم بھی اب تک کسی بیابان میں بسے رہے ۔ واقعی خدا کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں ۔ رات گئے تک رونق ہوتی ۔ بلکہ آدھی رات تک رونق ہوتی ـــــ نہیں بلکہ رات بھر رونق ختم ہی نہ ہوتی ۔ آپ رات کے دو بجے باہر آجائیں آپ کو کئی لوگ اِدھر اُدھر چلتے پھرتے ضرور نظر آئیں گے ۔ ہم اس آباد زندگی سے خوش تھے ۔ لگاتار شور وغل اور ہنگامہ رہتا ۔ میاں ہمارے بھی جلد گھر لوٹ آتے ۔ دیر تک نیند نہ آتی ۔ ہم بھی اس شور وغل کا حصّہ بن گئے تھے ۔ صبح جلد آنکھ کھل جاتی ۔ مہینہ بھر اس گہما گہمی میں ایسے کھوئے کہ پوچھیے مت ۔ ایک دن دوپہر کے وقت باہر برآمدے میں بچّوں کا انتظار کر رہی تھی ، وہ آئے تو دیکھا چھوٹے کا چہرہ زرد بلکہ سفید ـــــ جیسے کہ بدن میں خون ہی نہ ہو ۔ گھبرا گئی کہ اس کی طبیعت خراب ہے ۔ دوسرے کا دیکھا تو وہ بھی کچھ عجیب سی حالت میں لگا ۔ بیگ مونڈھوں میں پھنسائے کمر پر اُٹھائے ہانپتا ہوا زینہ طے کر رہا تھا ۔ اوپر پہنچا تو دیکھا ہونٹ سوکھے ہوئے ۔ جسم سفید سا ۔ بلکہ سامنے کے ٹوٹے دانتوں میں سے ننھی سی زبان تک سفید لگ رہی تھی ع

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

جب بچّوں کے آنے کا وقت ہوتا تو میں اندر کھانا بنا رہی ہوتی ۔ آج ذرا پہلے فارغ ہو گئی تھی ۔ باہر کی روشنی میں اُن کی صورتیں دیکھیں تو حیران رہ گئی ۔ پھر میں نے خود کو آئینے میں دیکھا تو پتہ چلا کہ اپنی دس برس بڑی بہن لگ رہی ہوں ۔ رنگ پیلا ۔ آنکھیں حلقوں میں گڑھی ہوئیں ۔ ہونٹ سفید پڑ رہے ہیں ۔ یہ ہم سب کو آخر کیا ہو گیا ہے ۔ وہ شام کو لوٹے تو چڑچڑے سے ۔ خیال آیا کہ پچھلے کئی دنوں سے یہ بات میں نے ان میں محسوس کی تھی مگر میں نے کچھ دھیان نہ دیا ۔

خیر رات کو پریشان سی میں سونے کی کوشش کرنے لگی۔ ساتھ والی پارک میں شام سے ڈھول بج رہا تھا۔ اب کچھ دیر سے شہنائی کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ بچوں کو زور زور سے تھپک تھپک کر سلایا کہ انھیں جلدی سکول جانا ہوتا ہے صبح۔ شہنائی کی آواز بیچ بیچ میں بند ہوتی تھی۔ اس طرح کے ایک وقفے میں مجھے نیند آنے لگی۔ ساڑھے دس بج رہے تھے۔ میری آنکھ لگ گئی ...... "مونگ فلے تا جے" یہ آواز زور زور سے کانوں سے ٹکرا کر دماغ تک پہنچ گئی۔ میں نے کروٹ بدل لی۔ میں دوبارہ سونے ہی والی تھی کہ پھر وہی زوردار ہانک "مونگ فلے تا جے ..." اور پھر تقریباً ساڑھے گیارہ بجے تک مونگ پھلی والا اپنی تازہ مونگ پھلیوں کا ڈھنڈورا پیٹتا رہا۔ اس کا ساتھ دینے کے لیے اس بیچ چاٹ والا اپنے بڑے سے توے پر زور سے کڑچھی مار مار کر تال دیتا ہوا اپنی آمد کی اطلاع کرتا۔ شہنائی اب بھی بج رہی تھی مگر اب اس کی عادت سی ہونے لگی تھی کہ آواز ایک ہی لے میں آرہی تھی۔ ایک بار پھر نیند آنکھوں میں آہی رہی تھی کہ ریل کی سیٹی چنگھاڑتی چلاتی، بولتی گزر گئی۔ کچھ دیر بعد میں بیچ مچ سو گئی۔ کچھ ہی منٹ سوئی تھی کہ نیچے سڑک پر موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے کی آواز آنے لگی۔ اور آتی چلی گئی۔ کیونکہ موٹر سائیکل تھی کہ اسٹارٹ ہو ہی نہیں چکتی تھی۔ اور اس میں سے کڑوا کسیلا دھواں اڑ اڑ کر کمروں میں گھسنے لگا۔ میرے میاں کافی دیر سے کروٹ بدل بدل کر اب اٹھنے ہی والے تھے کہ موٹر سائیکل اسٹارٹ ہو گئی اور ہم لوگ پھر سونے کی کوشش کرنے لگے کہ پارک میں سے زور زور سے شہنائیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ شاید دس سے زیادہ شہنائی وادک اپنی "کلاکی پردرشنی" کر رہے تھے۔ اس پارک میں تو تقریبات ہوتی ہی تھیں پھر اس کے ساتھ کھلونے والے، آئس کریم والے، چھابڑی والے پکارتے جارہے تھے۔ کبھی ٹھہر کر، کبھی گھوم گھوم کر۔

بہر حال شہنائی تو پھر موسیقی ہے۔ چاہے کتنا ہی شور مچا رہی ہو، مجھے نیند ضرور آنی چاہیے۔ میں نے خود کو شہنائی کی تعریف میں سوچ سوچ کر سونے کی کوشش کرتے ہوئے پایا۔ مگر اب اس کے ہمراہ ڈھول بھی زور زور سے پیٹا جا رہا تھا۔ تمام بینڈ باجے زور زور سے بجنے لگے۔ اس دوران دو بج گئے۔ اور دو بجے کے بعد واقعی خاموشی چھا گئی۔ اور ہم سچ مچ سو گئے۔

ٹھیک پانچ بجے کباڑی نے چلا چلا کر جگایا اور چل دیا۔ میں نے سوچا آج ذرا چھ بجے

تک سولیں۔ ابھی صرف پانچ دس ہوئے تھے۔ دو ہی منٹ کے بعد کسی کے گانے کی — نہیں رونے کی — بلکہ رو رو کر گانے کی آواز آنے لگی، "دیدے ماں — دیدے بابا — بچّہ بھوکا ہے۔" کوڑھی بھکاریوں کی ایک ٹولی گا گا کر بین کر رہی تھی۔ اور ایک طویل قامت عورت ایک چھوٹے سے بچّے کو گود میں بٹھائے ریڑھی دھکیل رہی تھی جس پر ایک بوڑھا کوڑھی بغیر انگلیوں کے، پٹی بندھے ہوئے دو ہاتھوں کے درمیان بڑی مہارت سے بیڑی تھامے ہوئے کش لے رہا تھا۔ میں نے بالکنی سے کچھ سکّے پھینکے۔ دروازہ بند کر کے اندر آنے ہی والی تھی کہ آواز آئی "برتن قلعی والا — " وہ قلعی گر، "والا" اتنی اونچی آواز میں کہہ رہا تھا کہ بچّے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ میں نے سونے کا ارادہ ترک کر دیا اور باہر آ گئی۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ تھوڑی دیر میں دوسری آواز آئی۔ " آلو۔ گوبھی۔ ٹماٹر۔ بیگن۔ کھیرا۔ اربی۔ گاجر۔ بھنڈی۔ کریلا۔ ٹنڈا — آ آ آ ..." اور اس کے بعد اور کئی پھلوں اور سبزی والوں کی آوازیں۔ اس کے بعد خشک میوہ بیچنے والا گزرا۔ پھر ایک آدمی ایک پیٹی اٹھائے گزرا، "سر کا۔ باڈی مساج کرا لو — او — او۔" اس کے بعد گلے میں میلا سا تھیلا لٹکائے ایک بڑے میاں گزرے۔ "کان صاف کرا لو" پھر تین چار دُھنیے ایک قطار میں سائیکلوں پر دھنائی والے بانس بجاتے ہوئے گزرے۔ اس کے بعد ایک طویل قامت دیہاتی بڑی بڑی جوتیاں جن کی ناکیں یا نوکیں اوپر کو مڑی ہوئی تھیں پہنے ہوئے چیختا ہوا گزرا، "چارپائی، منجے بُنوا لو" ساتھ ہی ایک لڑکا اپنے سوکھے ہوئے پیٹ سے پالش کی پیٹی لگائے "پالیش والا ئے" کہتا ہوا گزرا۔ اس کے بعد ایک صاف ستھرا نوجوان جدید طرز کے بال تراشے، اوپر زرد رنگ کی ٹی شرٹ مگر نیچے سیاہ دھوتی لپیٹے ہاتھ میں سرخ رنگ کے پنجرے میں سبز طوطا قید کیے ہوئے گزرا، "قسمت پڑھوا لو — بھوِش جان لو —" اس کے بعد رضائیوں کے غلاف بیچنے والا، گاؤ تکیے اور چادروں والا۔ بھالو اور بندر والا، اونٹ کی سواری والا ...

بہر حال — یہ تو ابھی شروعات تھیں۔ ابھی صرف چھ بج کر تیس منٹ ہوئے تھے۔ یہ سلسلہ تو روز کا تھا اور آدھی رات تک کا تھا۔ پھر یہاں تو وہ عجیب عجیب سوداگر گھوما کرتے کہ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ آپ نے بیک وقت ان سب کو ایک ہی جگہ ہرگز ہرگز نہ دیکھا ہوگا۔

نہ سنا ہوگا۔ خیر نیند تو کم ہو ہی گئی تھی۔ تو کیا ہوا۔ آخر سو کر انسان وقت ہی تو گنواتا ہے۔ اب مصروف اور بارونق علاقوں میں یہ سب تو ہوگا ہی۔

بچے سکول جانے کو تیار ہو گئے تھے۔ ان کی تو نیند ہی پوری نہ ہو پاتی تھی۔ سفید سفید ستے ہوئے چہروں کو خدا حافظ کہہ کر میں اندر لوٹ آئی۔ میاں جی بستر پر کروٹیں بدل رہے تھے۔ ماتھے پر سلوٹیں تھیں۔ کچھ عمودی کچھ آڑھی۔ میری آہٹ پاکر آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ چہرے پر تھکن صاف نمایاں تھی۔ دن بھر آفس میں مصروف رہنے کے بعد انھیں گھر میں نیند پوری نہ مل پاتی تھی۔ جانے لوگ ادھر سوتے بھی تھے یا نہیں۔ میں ان کے لیے چائے بنانے جا رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ ہمارے کچھ رشتہ دار سامان لیے آرہے تھے۔ ایک بڑی بی مجھے لپٹاتے ہوئے گویا ہوئیں، "مبارک ہو بٹیا، یہی تو فائدے ہیں بیچ شہر میں رہنے کے۔ ابھی ابھی ٹرین پہنچی، پھاٹک پار کیا، تم سامنے اور اب تو موسم بھی اچھا ہو رہا ہے۔ اگلے ہفتے بڑی آپا بھی آئیں گی۔ خوب مزے رہیں گے۔"

بدلتے ہوئے موسم کی طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ ایک کمرشل ایریے کے اتنے سارے سائیڈ افکٹس (SIDE EFFECTS) میں اپنے میاں کو اطلاع کرنے اندر جانے لگی تو وہ سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ چہرے پر جھنجھلاہٹ اور بیچارگی لیے ہوئے میرے پاس سے گزرے تو دھیرے سے میرا شانہ تھپتھپایا۔ ڈرائنگ روم تک پہنچتے پہنچتے انھوں نے ایسی مسرت اور مسکراہٹ سے چہرہ سجالیا تھا جیسے اگر یہ مہمان نہ آتے تو ان کی ہر خوشی ادھوری ہی تو رہ جاتی۔ صبح کا یہ ذرا سا وقت جو کچھ PRIVACY میں گزرتا تھا وہ بھی گیا۔ اور شامیں بھی ان ہی کی نظر ہو جایا کریں گی۔ پھر یہ شور بے رت جگے ..... اُف ... پل پار کا وہ علاقہ۔ جانے کیوں آج مجھے رہ رہ کر یاد آرہا تھا۔

تِنکے

اتنے برسوں بعد جب وہ مجھے اتفاق سے ملی تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں تو پہچان ہی نہ پاتی اگر وہ مجھے اسی دھیمے سے میٹھے سے انداز میں نہ پکارتی۔ میں نے گزرتے ہوئے اسے دیکھا تو تھا، لیکن پھر ایک سیکنڈ کے لیے اپنے دماغ میں آئے اس خیال کے غلط ہونے کی تصدیق میں نے خود ہی کر دی کہ یہ تو وہ نہیں ہو سکتی۔ ہلکی سی مانوسیت کا شائبہ تو کئی چہروں میں مل جاتا ہے۔ مگر وہ چہرہ کچھ الگ تھا۔ میری دانست میں سب سے جُدا۔ وقت نے اسے ایک عام سا چہرہ بنا دیا تھا، تو میں کیسے پہچان پاتی۔ صرف اس کی آنکھوں میں اِن سیکیورٹی (INSECURITY) کا وہ احساس آج بھی تھا۔ جو بچپن میں ہوا کرتا تھا۔ کیا اس نے شادی نہیں کی تھی؟ پھر اس کی بھی کیا گارنٹی ہے کہ شادی کے بعد لڑکی اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرے۔

شہر کے سب سے عمدہ انگریزی اسکول میں پڑھا کرتے تھے ان دنوں ہم۔ وہ میری کلاس فیلو تھی۔ پتہ نہیں کیوں بہت عزیز تھی مجھے وہ۔ اس کے چہرے کے بولتے ہوئے خاموش تاثرات مجھے ہمیشہ متاثر کرتے تھے۔ ہماری دوستی صرف اسکول تک ہی محدود تھی۔ ہم نے کبھی ایک دوسرے کا گھر دیکھا تک نہیں تھا اور ایک دن اس نے مجھے گھر آنے کی دعوت دینے میں پہل کی تو، خوش ہو گئی تھی میں اور میں نے بے ساختہ پوچھا تھا کہ کس خوشی میں بلایا جا رہا ہے ہم کو؟ تو وہ بولی تھی کہ ہمارے ہاں دُلہن آئے گی۔ لیکن نہ تو کوئی اس کا بڑا بھائی تھا جس

کی شادی ہونا ہو، اور نہ ہی کوئی اور ایسا رشتہ دار۔ وہ بے وقوف تو نہیں تھی اور میں بھی نادان نہیں تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے مجھے کوئی جواب نہ دے کر ان گنت سوالوں کے بیچ تنہا چھوڑ دیا تھا۔

میں پُر اشتیاق، شام کو اس کے گھر پہنچ گئی۔ گھر میں زیادہ چہل پہل نہیں تھی۔ مگر سارے ماحول سے یہ تاثر تو مل ہی جاتا تھا کہ گھر میں کوئی تقریب ہو رہی ہے۔ اس نے مجھ سے سب کو ملوایا۔ اپنی تین ننھی منی بہنوں سے، اپنے ابّا سے اور اپنی دادی جان سے۔ میں وہیں اس کی دادی جان کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ مجھ سے ایسے ہی باتیں کرنے لگیں جیسے میری عمر کی بچیوں سے اکثر کی جاتی ہیں۔ یعنی میری پڑھائی اور میرے مشغلے کے بارے میں۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ میرے خیالات ان دنوں بھی آج جیسے میچور (MATURE) تھے اور کوئی بات جس کے بارے میں، مَیں جاننا چاہتی تھی اس کی تہہ تک پہنچ کر ہی دم لیتی۔

میری پریشانی یہ تھی کہ کسی نے اب تک مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ کس کی دُلہن آ رہی ہے؟

میں کئی سوچوں میں غرق دادی جان کے پاس صوفے پر بیٹھی اپنے پیر ہلا رہی تھی کہ جانے کہاں سے ایک اچھی نسل کا خوب صورت سا کتّا آگیا۔ میں اس کے سفید ملائم بالوں کو چھونے کا تصوّر باندھ ہی رہی تھی کہ اس نے مجھ پر زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا۔

میں سہم کر دادی جان کے اور قریب ہو لی۔ دفعتاً دادی جان کتّے سے انگریزی میں زور سے یوں مخاطب ہوئیں۔ "شٹ اپ — گو — گو۔" کتّا یکایک خاموش ہو گیا اور دوسرے ہی لمحے دُم ہلاتا ہوا چپ چاپ چلا گیا۔ میری جان میں جان آئی۔ شکر ہے کتّا انگریزی تو سمجھ گیا۔

میں ابھی اس حادثے سے سنبھل ہی رہی تھی کہ سیاہ چادر اوڑھے ایک خاتون اندر آئی اور

چائے کی کشتی رکھ کر چلی گئی۔ میں اس پر غور کیے بغیر نہ رہ سکی۔ کیونکہ اس کا چہرہ سوائے داہنی ایک آنکھ کے پورا چھپا ہوا تھا۔ سیاہ چادر میں جھانکتا ہوا اس کے چہرے کا وہ کونا بے حد حسین تھا۔ میں نے دادی سے یوں ہی پوچھ لیا "یہ کون ہیں؟" وہ کچھ پس و پیش کے بعد جواب دینے لگیں۔ "یہ ــــ یہ ــــ یہ تو" اتنے میں وہ عورت پھر آگئی۔ ٹرے میں کچھ ناشتہ لیے ہوئے۔ اب کی بار میں نے اسے غور سے دیکھا۔ پھولوں کی ڈالیوں جیسے ہاتھ۔ اس کی چادر سرکنے لگی۔ جس کو سنبھالنے کی کوشش میں، میں نے اس کی دونوں آنکھیں دیکھیں۔ بڑی بڑی کالی کالی، بے حد خوبصورت۔ لیکن بہت سنجیدہ ــــ اس کے ہاتھوں میں کپکپی تھی۔ فاختہ جیسے دو نازک پیر دھیرے دھیرے زمین پر رکھتی ہوئی وہ واپس چلی گئی۔ چادر کو دوبارہ سنبھالنے کی کوشش میں اس کی چوڑیوں کی ہلکی کھنک نے سوگوار سی ایک دھن چھیڑ دی چائے کی خوشبو اور چاندی کے ورق میں لپٹی ہوئی برفی میں مجھے کوئی دلچسپی محسوس نہ ہوئی۔ اور میں وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی اپنی دوست کو ڈھونڈنے وہ مجھے رسوئی گھر میں ملی۔ کسی سے کچھ بات کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی مڑی اور اپنے ساتھ باہر لے آئی۔ برآمدے میں بچھے صوفے پر مجھے دوبارہ اس نے اپنے اور دادی جان کے درمیان بٹھا دیا۔ مجھے اس پر بے حد غصہ آنے لگا۔ غصے کی اس کڑواہٹ کو میں پی نہیں پا رہی تھی کہ اس نے برفی کا میٹھا ٹکڑا اپنے پیار بھرے ہاتھوں سے میرے منہ میں رکھ دیا۔ اور میرے ذہن کی تلخی اس مٹھاس کے ساتھ خلط ملط ہونے لگی۔

اس کے ابا وہاں سے گزرے اور اسے بلا کر اپنے ساتھ اندر لے گئے۔ خاصے وجیہہ قسم کے انسان تھے۔ کافی خوش خوش سارے گھر میں گھوم رہے تھے۔ یہی کوئی اڑتالیس پچاس کا سن ہوگا۔ اور بھاری بھر کم ڈیل ڈول۔

میں نے دلہن کے آنے کا انتظار نہ کیا اور جانے کیوں ناراض سی وہاں سے چلی آئی۔

کچھ دن وہ اسکول نہ آئی اور پھر زندگی ویسے ہی معمول پر آگئی۔ میں نے اس سے دلہن کے بارے میں کچھ نہ پوچھا۔ کئی دنوں کے بعد میں اس کے گھر گئی تو سب لوگ لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔

یعنی اس کی چھوٹی بہن، اس کے ابا اور ایک نوخیز سی لڑکی لگ بھگ اٹھارہ برس کی سجی سجائی دادی جان کے پاس صوفے پر بیٹھی تھی چپ چاپ سی۔ میری سہیلی کے ابا بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ تین ننھی منی گڑیوں جیسی لڑکیاں ان کے ارد گرد گول گول گھوم رہی تھیں۔ دفعتاً ان میں سے دو بچیاں لپکیں اور صوفے پر بیٹھی ہوئی لڑکی کو کھینچ کر لے آئیں اور اسے اپنے ساتھ دوڑانا شروع کیا۔ ان کے ابا بھی ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ پہلے تو وہ لڑکی کچھ جھجکی جھجکی سی دوڑنے لگی۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد کھل کر بچوں کے ساتھ کھیلنے میں مشغول ہوگئی۔ جانے کتنی دیر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ میری سہیلی کے ابا کچھ دیر اس لڑکی کی اسپیڈ کے مطابق دوڑنے کی کوشش کرتے رہے پھر ناکام ہوکر ہانپتے ہوئے صوفے پر آ بیٹھے۔ کسی چور کی طرح کنکھیوں سے گھر کے اندر کی طرف نظر گھمائی۔

جلدی سے انھوں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

اس دن میرے ذہن کے اسکرین پر لکھے تمام سوالات جیسے غائب ہو گئے اور ان کی جگہ جوابات نے لے لی۔ میں یونہی ٹہلتے ٹہلتے ڈرائنگ روم میں آگئی جو پچھلی تقریب کے دن مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک سجے سجائے شوکیس میں تصویروں کے درمیان ایک تصویر ایسی تھی جس سے نظریں ہٹانے کو میرا جی نہ چاہا۔ وہ سیاہ چادر والی حسین عورت ایک فریم کے اندر سرخ جوڑا پہنے شرمائی سی میری سہیلی کے ابا کے ساتھ کھڑی تھی۔ دونوں خوش اور مطمئن نظر آرہے تھے۔ تصویر میں وہ سیاہ چمکیلی آنکھیں کئی خواب لیے ہوئے تھیں۔

شوکیس کے باہر اور اوپر ایک بڑی سی تازہ تصویر میں اس کے ابا مونچھوں پر خضاب لگائے اور ساتھ میں وہ لڑکی —— میرا جی دیکھنے کو نہ چاہا۔ میں بے خیالی میں ٹہلتی ہوئی باورچی خانے کی طرف آگئی۔ وہ سیاہ چادر والی خاتون مختلف پکوان بنانے میں مصروف تھی۔ مجھے اس کا آدھا چہرہ نظر آرہا تھا۔ کمہلایا ہوا سا۔ ہونٹ ایک دوسرے کے ساتھ ایسے چپکے ہوئے تھے جیسے وہ کبھی بولتی ہی نہ ہو۔ اس کی پیٹھ پر جانے کب کی گندھی ہوئی چوٹی لٹک رہی تھی۔ وہ کسی روبوٹ (ROBOT) کی طرح رینگتی ہوئی اپنے کام میں مصروف تھی۔

جیسے کوئی لاش حرکت کر رہی ہو۔ وہ بار بار لمبی سانسیں لیتی جا رہی تھیں۔ مگر کام کرنے کی رفتار بدستور تیز تھی ہاتھوں کی حرکات تلی تلی تھیں۔ جیسے کہ اُن ہاتھوں کو مشین کے پرزوں کی طرح اپنی ہر اگلی حرکت کا پہلے سے علم بھی ہو اور اندازہ بھی۔ ڈرائنگ روم میں لگے فریم کے اندر کی تصویر میں وہ اٹھی ہوئی گردن اب ایک طرف کو خمیدہ بھی تھی۔ جیسے اس کے کندھے گردن کا بوجھ نہ اٹھا پا رہے ہوں۔

وہ گم تھی اپنے کام میں، اپنے خیالات میں۔ سکڑی ہوئی سی، سمٹی ہوئی سی۔ جیسے خود سے خود کو چھپا رہی ہو۔ جیسے اس کا وجود کوئی گناہ ہو۔
ابھی تک اس نے مجھے دیکھا نہ تھا۔ اچانک وہ دروازے کی طرف مڑی تو اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ نہ وہ ٹھٹھکی نہ بولی۔ بس ایک نظر دیکھا اور کام میں مصروف ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی ناک کے اوپر کئی ٹانکوں کے نشان لگے ہوئے تھے۔ اور ناک خم کھا کر نیچے کو بیٹھ گئی تھی۔ اس کا حسین چہرہ داغ دار ہو گیا تھا، لیکن اتنا نہیں کہ اسے کسی دوسرے چہرے سے REPLACE کیا جاتا۔ اتنی بڑی سزا نہ تھی اس کے اس جرم کی جس میں اس کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔
میری دوست نے بتایا کہ ایک ایکسی ڈنٹ میں یہ سب کچھ ہوا تھا جس میں اس کی امّی نے اس کے ابّو کو بچانے کی خاطر خود کو آگے کر دیا تھا۔ ———— مجرم منصف تھا۔ جس کی خاطر اس نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنا حسن داغ دار کر دیا۔ اسی نے اسے ———— بہانہ یہ تھا کہ بیٹا نہ دیا اس نے اسے۔ دادی ماں تو خدا واسطے کا بَیر رکھتی تھیں اس سے۔ بیٹے نے اور شہہ پائی اور بیٹی کی عمر کی دلہن لے آئے۔ میرے سارے وجود پر اس دن ایک پہاڑ آن گرا تھا۔ آج تک میں اپنی روح کو اس غم

بنا کچھ کہے کیا کیا سمجھا گئی تھی، ـــــــ اس اتنی سی عمر میں مجھے وہ سے آزاد نہ کر پائی تھی۔ اسے میں نے ہمیشہ گرہ میں باندھ لیا۔ یہ کیسا رشتہ ہوتا ہے آخر۔ نہ خون کا، نہ دوستی کا، محبت کا؟ نہیں، محبت تقاضے نہیں کرتی۔ اپیرنس (APPEARANCE) کی کسوٹی سے نہیں ناپتی۔ انسان ہو کر کسی دوسرے انسان کی زندگی میزریبل (MISERABLE) نہیں بناتی۔

کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی۔ جب میں پھر وہاں گئی تو دلہن امید سے تھی ـــــ دادی جان اور ابا تو پھولے نہیں سما رہے تھے۔ جیسے نئے اور نوعمر دولہا کے یہاں پہلی خوشی ہونے والی ہو۔ دادی جان نے کتھئی رنگ کے موزے اور سوئٹر بننے شروع کر دیے۔" پہلی کی کوکھ میں قالب ہی لڑکیوں کا تھا،" فخر سے کہا کرتیں۔" دلہن تو بیٹا جنے گی۔"

آنے والے مہمان کے لیے ایسے ایسے کھلونے لائے گئے جو پہلے پہل میری سہیلی کی پیدائش پر آئے تھے۔ باقی کی تین تو ٹوٹی پھوٹی گڑیوں سے ہی دل بہلاتی رہیں۔ میری سہیلی جو کانونٹ میں پڑھ رہی تھی، اسکول سے اٹھا دی گئی۔ اس کے ذمّہ دلہن امیّ کی دیکھ بھال کا کام تھا۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں ماں کو مستقل اداس دیکھ کر اداس سی رہا کرتی تھیں جیسے ان کی سمجھ میں سب کچھ آتا ہو۔

ان کے ابا ہر وقت دلہن امیّ کے کمرے میں گھسے رہتے اور وہ اپنی امیّ کے ہاتھوں کے بنے لوازمات ان کے کمرے میں پہنچاتی رہتیں۔

ادھر ان کی امیّ کچھ زیادہ ہی دبلی ہو گئی تھیں۔ ان کی آنکھوں کی وحشت کچھ اور بڑھ گئی تھی رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ وہ اب کسی کے سامنے آنے سے گریز کرتیں۔ اور اکیلا رہنا ہی پسند کرتیں۔ اپنی کھوئی ہوئی خود اعتمادی اور اپنے شوہر کی بداعتمادی کے ساتھ جس میں سوائے اس کے اور کوئی دوسرا نہ جھانکے۔

۔ ویسے بھی سارا گھر سوگواری کی تصویر پیش کرتا تھا۔ سوائے دلہن والے کمرے کے۔ اس کمرے سے روشنی ایسے باہر آتی تھی جیسے ویران کھنڈر

کے کسی کونے میں ایک تیز روشنی والا ٹیبل لیمپ جل رہا ہو۔ جو صرف اپنے قریب کا ہی اندھیرا دور کر سکتا ہے۔ باقی تاریکی کو اس کا کوئی فیض نہ پہنچتا ہو۔

آخر یہ ہڈیوں کا ڈھانچا عورت کس سہارے زندہ ہے۔

کس لیے زندہ ہے ــــــــ شاید ــــــــ

ان ننھی بے سمجھ کلیوں کو احساس زندگی دلانے کے لیے۔

چھوٹی بہو کا بڑا بڑا پیٹ دیکھ کر دادی اماں کو پورا یقین تھا کہ بیٹا ہی ہے۔ پر اس کی تو وہی جانے۔ ہوئی بیٹی گول مٹول سی۔ پھر بھی نئی بیوی تو نئی بیوی ہی تھی ــ میاں اسے اپنے ادھیڑ عمر کے وجود پر نوجوان ہونے کی سند سمجھتے تھے۔ وہ بھی خیر سے ان کے کسی معاملے میں دخل نہ دیتیں۔ پوری طرح آزاد تھے وہ۔ جب چاہیں گھر آئیں۔ جہاں چاہیں جائیں۔ کبھی نہ پوچھتی کہ کہاں سے آئے اور کہاں جا رہے ہیں۔ میاں فخر سے کہا کرتے سب سے کہ ہماری بیگم تو ہمارے بہرے کا تل ہیں۔ جس نے ہماری زندگی کو خوب صورت بنا دیا ہے۔ واقعی یہ فرق تھا دونوں میں۔ پہلی تو بہت پزیسو (POSSESSIVE) تھیں۔ ان کے ہر لمحے کا حساب رکھنے والی۔ ایک پل ان کے دیر ہو جانے پر آٹھ آٹھ آنسو بہا کر دس دس سوال کرنے والی۔

کبھی کبھی میں وہاں جاتی تو لان میں عجیب و غریب منظر دیکھنے کو ملتے۔ میری دوست کے ابّا یوں بھی کافی بے ڈول ہو گئے تھے۔ اس بظاہر بے فکری کی زندگی سے، اپنی نوزائیدہ بچّی کے ساتھ کھیلتے ہوئے۔ عجیب عجیب حرکتیں کرتے۔

کبھی خواہ مخواہ بچّی کے گرد دوڑنا

شروع کر دیتے اور پھر اپنی نوخیز بیوی سے چھپ کر لمبے لمبے سانس لیتے

مگر یہ سب اُس سے چھپتا نہیں تھا۔ اور وہ ان سب

حرکتوں سے بیزار سی لگتی تھی۔

نئی امّی کی اصل بیزاری کی وجہ کچھ دن بعد میں خود ہی سمجھ گئی۔ ان کے ایک رشتہ کے بھائی، جو اُن کے تقریباً ہم عمر تھے، اکثر وہاں آیا کرتے تھے۔ ادھر کئی دنوں سے وہ یکسر غائب تھے۔ وہ بے چین ہو گئی تھیں اور پریشان سی رہا کرتی تھیں۔ ایک دن وہ سب کی نظریں

بچاکر میرے پاس آئیں اور بڑی لجاجت سے بولیں۔" مجھے ایک خط لکھ دو۔ پر کہنا نہیں کسی سے۔"
میں چپ چاپ خط لکھنے لگی۔ آدھے سے زیادہ خط تحریر کر چکی تھی کہ ان کے میاں اچانک کہیں
سے آدھمکے۔ میاں بیوی کا رشتہ ہی ایسا ہے کہ اگر دو میں سے کسی ایک کے دل میں ذرا سا بھی
چور ہو تو دوسرے سے ہرگز نہیں چھپ سکتا۔ انھیں بھی غالباً پہلے سے کچھ شبہ تھا۔ آج اس کی
تصدیق ہو گئی۔

پھر دوبارہ میں وہاں نہیں گئی۔ آج اتنے برسوں بعد میری وہ پیاری دوست مجھے ملی۔ پہلا
سوال یہ تھا کہ اس کی امی کیسی ہیں اور پھر یہ کہ اس کی اپنی زندگی کیسی ہے۔

کیسی ہوتیں اس کی اپنی امی جو اتنے برسوں سے نیم مردہ سی جی رہی ہیں۔ جس دن وہ خط
ان کے ابا کے ہاتھ لگ گیا، انھیں اپنے بارے میں تمام خوش فہمیوں کا علم ہو گیا تھا۔ وہ جان گئے
تھے کہ دلہن ان کے چہرے کا تل تو ضرور تھیں۔ مگر ایسا نہیں جو خوبصورتی بڑھاتا بلکہ ایسا سیاہ
داغ جو وسیع و عریض بن کے ان کی پوری شخصیت پر لگ چکا تھا۔ وہ بھلے ہی اسے اپنی نوجوانی کا
سرٹیفکیٹ سمجھ رہے تھے مگر زمانہ تو یہ کہتا رہا کہ انھوں نے اس عمر میں ایک نوخیز لڑکی کی زندگی
خراب کر دی ہے۔ انھیں اس بے جوڑ رشتے کا احساس ہوا تھا

انھیں اچانک اپنے تمام گناہ یاد آ گئے تھے۔ انھیں احساس ہو گیا تھا
کہ وہ ایسی دوڑ دوڑنے کی کوشش کر رہے تھے، جس میں ان کا پیچھے رہ جانا یقینی تھا۔ عمر کے
اس دور میں وہ نوعمروں کی رفتار کہاں سے لاتے۔ اس دوڑ میں تو انھیں ہارنا ہی تھا یا تو انھیں
اسے چھوڑ کر جانا پڑتا یا وہ انھیں چھوڑ کر چلی جاتی۔ آخر میں ہوئی دوسری والی بات۔ اس دن
دلہن کے رشتے کا بھائی آیا اور وہ اس کے ساتھ چلی گئی، کبھی لوٹ کر نہ آنے کے لیے ——

اور وہ —— وہ کس منہ سے اس ستم زدہ عورت کا سامنا کرتے

وہ گھر کے پچھلے کونے والے ایک کمرے میں رہتی تھیں۔ مہینوں سے بستر سے لگ چکی تھیں۔
ایک عرصے سے انھوں نے مکان کے اس طرف رخ ہی نہیں کیا تھا۔ جیسے وہ گھر کا بے کار حصہ
ہو۔ بالکل اس کمرے کے مکین کی طرح جو اب ایک بے کار شے تھی مشکل سے سانس لیتی ہوئی،
باقی سب تو چھوٹ گیا تھا اس کا، چلنا پھرنا ہنسنا سونا یہاں تک کہ کھانا پینا بھی۔ زندگی کے

نام پر اس کے پاس رُک رک کر آتی ہوئی سانسوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ کوشش کی تھی اس نے زندہ رہنے کی۔ حالات سے سمجھوتہ کرنے کی۔ پر اس کا حساس دل کسی طرح نہ مانا اور وہ رنج و الم کے اس سفر پر تنہا ہی نکل پڑی تھی۔

وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اس کے کمرے کے دروازے تک آکر رُک گئے۔

خالی خالی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔ پھر اپنی تمام تر ہمت یک جا کر کے اس اجڑے ہوئے کمرے میں آگئے، مگر ایک لفظ نہ بول پائے۔ سیاہ حلقوں میں دھنسی ہوئی دو موٹی موٹی ویران آنکھیں انھیں ایک ٹک دیکھ رہی تھیں۔ آگے بڑھ کر دو چھوٹے چھوٹے سرد پاؤں پکڑ لیے ——— وہ کب — بے جان ہوئے تھے۔ انھیں کچھ معلوم نہ ہوا۔ اس کے بعد ——— زیادہ دیر تک جی نہ سکے اور پھر میری دوست اس دنیا میں تنہا رہ گئی۔ لیکن اس نے ہمت سے کام لے کر اپنی چھوٹی بہنوں کو پڑھایا، اور ان کی شادیاں کیں۔

اس کی امّی کیسے سسک سسک کر جیتی اور مرتی رہی۔ کیسے کیسے دل خراش منظر اس کی آنکھوں نے دیکھے تھے۔ کتنے دلدوز واقعے تھے وہ جب اس کے ابّا نئی دلہن کے ساتھ اٹھکھیلیاں کرنے کی کوشش کرتے اور اس کی امّی وحشت زدہ سی سارا منظر دیکھتی رہتی۔ سینے میں اٹھتے طوفان کو اپنے اجڑے ہوئے کمرے کی دیواروں سے سر اور مٹھیاں ٹکرا ٹکرا کر روکتی۔ تب وہ چپ چاپ دروازے کی دراز سے دیکھا کرتی اور خون کے آنسو روتی گھر کے کسی کونے کی طرف بھاگ جاتی اور چھپ چھپ کر روتی۔ میں اُس سے اپنا دوسرا سوال نہ پوچھ سکی کہ اس نے شادی کی یا نہیں۔ پوچھتی بھی کیسے؟

پانی کا رنگ

"یہ ذہانت اور یہ ملکوتی حسن ۔ اتنا حسین امتزاج میں نے آج تک نہیں دیکھا۔" نوجوان دانشور نے اس کی آنکھوں میں بغور دیکھ کر کہا " تم خود بھی ناواقف ہو گی اپنی خوبیوں سے کتنا تیز ہے تمھارا WIT جانتی ہو؟ میری تحریروں کو ایک جہاں نے سراہا۔ مگر کسی خاتون نے اس انداز سے انھیں سمجھا ہی نہیں۔ یہ تمھارا لباس، یہ رنگوں کا انتخاب۔ یہ شانے یہ ہاتھ ـــــــ تم ـــــــ تم سب سے مختلف ہو۔ کتنی اچھی ہو تم۔ کتنی اچھی طبیعت کی مالک۔" اور وہ مبہوت ہو کر سن رہی تھی۔ اس کی شخصیت کے سحر میں کھوئی ہوئی ساتھ ہی وہ حیران بھی تھی کہ آج وہ موضوع بدل کیوں نہیں رہا۔ آج سے پہلے اس نے اتنی دیر کبھی اس کی خوبصورتی کی باتیں نہیں کی تھیں۔ دو ایک جملے ضمناً کہہ کر وہ ضرور کوئی اور بات کرنے لگ جاتا تھا اور یہ ہی بات اسے پسند تھی کہ وہ ہر دوسرے شخص کی طرح اس کے حُسن کے قصیدے نہیں گاتا۔ وہ حسین تو بلاشبہ بے انتہا تھی مگر اس میں دوسری کچھ خوبیاں بھی تھیں جو خود اسے اپنے حسن سے کہیں زیادہ عزیز تھیں۔ وہ ایک نہایت محنتی اور ذہین لڑکی تھی اکثر ذہین لوگ محنت کم کرتے ہیں مگر اس میں دونوں ہی باتیں برابر تھیں۔ اسے اپنی ذہانت پر فخر تھا مگر وہ اتنا حسین ہرگز نہ ہونا چاہتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ اپنی خوبصورتی کو اپنی ذہانت کے مقابلے میں کئی درجے کم کر دیتی۔ اسے اس بات پر ہمیشہ چوٹ پہنچتی کہ لوگ اس کی محنت اور ذہانت کو بھول جاتے ہیں اور صرف اس کا حسین ہونا یاد رکھتے ہیں۔ وہ ایک انسان بھی تو ہے۔

ایک مقبول صحافی ایک محنتی قلم کار۔ جب جب اس کا کوئی مضمون چھپتا تو مداحوں کے خطوط کے ڈھیر لگ جاتے۔ ٹیلیفون بار بار بجتا۔ لوگ اس کی تحریر کو فراخ دلی سے سراہتے۔ مگر ذاتی طور پر جب وہ کسی سے ملی وہ اس کے بے پناہ حسن کے آگے گونگا بھی ہو گیا اور بہرا بھی۔ اپنی سب خوبیوں سے گھٹ کر وہ صرف ایک حسین لڑکی ہو جاتی۔ اور دیکھنے والا نہ اس کے فن کا قدردان رہتا نہ اس کی ذہانت کا قائل۔ اس کا اپنا وجود اس کی روح کا دشمن بن جاتا۔ اس کی ترقی میں رکاوٹ بن جاتا اس کی سنجیدہ شخصیت کا رعب مخاطب کی حوصلہ شکنی کرتا اور پھر ہارے ہوئے عاشق اسے یکلخت نہ صرف REJECT کر دیتے بلکہ اس کے مخالف بھی بن جاتے۔ اس نے خود کو ہمیشہ اپنے اصولوں کے قلعے میں سنبھال کر رکھا اور زندگی کی کئی بہاریں تنہا گزار دیں اور شاید زندگی اہلیت کے قدردان کے انتظار میں ایسے ہی گزرتی رہتی اگر وہ اس محفل میں نہ آئی ہوتی اور یونہی بھیڑ میں اکیلی اکیلی ہوتی اگر کوئی اس کا تعارف اس سے نہ کرواتا جس کی وہ مداح تھی۔ جس کی ہر تخلیق میں وہ ڈوب جاتی تھی۔ جس کی ہر تحریر حقیقت کی ایسی سادہ عکاس تھی کہ پیچیدگی کہیں نظر نہ آتی اور پھر بھی ذہن ہر جملے کو سوچنے پر مجبور ہو جاتا اور دماغ کے دریچے وا ہونے لگتے اس طرح کہ دنیا کا ایک نیا مفہوم سمجھ میں آتا۔ وہ تھا وہ جادوئی طاقت رکھنے والا قلم کار۔ وہ اسے اس دور کا سب سے بڑا دانشور مانتی تھی۔ سب سے بڑا ادیب سمجھتی تھی۔ مگر اس کی کتابوں کی جلد پر چھپی اس کی تصویر کو اس نے کبھی قابلِ غور نہ سمجھا یا ادھر اس کا دھیان ہی نہ گیا کہ اس میں ایسی کوئی بات تھی بھی نہیں۔ تنگ سی پیشانی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ چپٹی سی ناک۔ ناتراشیدہ داڑھی۔ ہر تخلیق کے ساتھ اس کی وہی ایک تصویر چھپا کرتی تھی۔ مگر آج اسے سامنے سے دیکھا تو ——

اپنی تخلیقات کی طرح ہی خوبصورت تھا وہ۔ —— شعوری طور پر اس کی سنجیدہ

شخصیت نے خود اپنے آپ سے بھی کبھی ذکر نہ کیا تھا۔ مگر آج —— اس نے

—— سمجھ لیا کہ یہ ہی وہ سراپا ہے جسے اس نے سامنے دیکھنا چاہا تھا —— ہمیشہ۔ وہ دراز قد تھا۔ شانے چوڑے تھے۔ ناک کچھ بڑی تو تھی مگر بیٹھی ہوئی نہ تھی اور ناک کی جسامت

کو داڑھی نے تناسب دے دیا تھا۔ پیشانی چوڑی تھی مگر ٹیڑھی مانگ نکالنے کی وجہ سے اس
کے آدھے ماتھے پر بال بکھرے سے رہتے تھے جو سامنے سے بہت اچھے لگتے تھے آنکھیں
چھوٹی نہیں تھیں بلکہ اس کے مسکرانے کا انداز ایسا تھا کہ اس وقت آنکھیں کچھ سکڑ جاتی تھیں
اور آنکھوں کے گرد شاید لکھنے پڑھنے سے ہلکے سرمئی ہالے سے تھے۔ آنکھوں میں گہرائی کے
ساتھ ساتھ چمک بھی تھی اور کچھ ہلکی ہلکی شرارت بھی، جیسے اس کی تحریر میں ہوا کرتی تھی۔ سنجیدگی کے
ساتھ ساتھ اک ذرا سی مزاحیہ یا طنزیہ چبھن بھی۔ چہرے سے ذہانت ٹپکتی تھی اور تاثرات سے
متانت اور خود اعتمادی۔ اس فہمیدہ اور بردبار چہرے کے ساتھ ہلکے سرمئی ہالوں میں گھری ہوئی دو چمکتی ہوئی
مگر کچھ کچھ شریر آنکھیں کچھ زیادہ میل نہ کھاتی تھیں مگر جس اپنائیت سے وہ اسے "ہیلو" کہتے
ہوئے مسکرایا تھا اس وقت اس کی ان آنکھوں نے بھی اپنائیت اوڑھ لی تھی جیسے کوئی رشتہ
کوئی شناسائی پہلے سے ہو۔ شاید انھوں نے اسے کہیں پڑھا ہوگا وہ سوچنے لگی اور

جواب میں وہ بھی مسکرا دی اور ________ اسے ________
خیال آیا کہ وہ اپنی انگلیوں کے پوروں سے اس کے ماتھے پر بکھرے بکھرے بالوں
کو ایک طرف کر دے اور مٹھی بند کر کے اس لمس کو________ محفوظ کر لے۔ وہ
اسے مسکراتے ہوئے دیکھتی جا رہی تھی۔ فرشتوں کے سے اس معصوم حسن کی محویت دیکھ کر
وہ بھی اسے دیکھ رہا تھا مگر اس کے چہرے کے تاثرات میں ایک ٹھہراؤ تھا۔ فوراً ہی وہ
بھی ہوش میں آ گئی اور رسمی علیک سلیک کے بعد دوسری طرف چلی گئی۔

پھر کچھ دن بعد اس نے جب اسے فون کر کے اپنی نئی کتاب کے اجرا میں بلایا تو وہ
نہیں گئی اسے اس کمزوری سے ڈر لگتا تھا جو اس کی موجودگی میں اسے اپنے اندر محسوس ہوتی تھی۔
اس کے بعد بھی وہ اسے کبھی نہ کبھی ٹیلی فون کرتا اور اس کے کام اس کے پروفیشن کے بارے
میں بات کرتا۔ کبھی گفتگو طویل ہو جاتی۔ وہ دنیا بھر کی باتیں کرتا مگر اس کے حسن کی کبھی
تعریف نہ کرتا۔ اور یہ بات وہ اتنا زیادہ پسند کرتی کہ اسے اپنے اندر خوشیوں کے چشمے پھوٹتے
ہوئے محسوس ہوتے۔ جب وہ اس سے ملی تو وہ اسے اور بھی زیادہ اچھا لگا۔ سادہ سا،

اپنے آپ سے بے خبر سا، اس کے حسن سے لاتعلق سا۔ اب اسے اپنے کمزور ہو جانے کا ڈر نہیں محسوس ہوتا
تھا کہ وہ خود کو اس کی قربت میں مسرور بھی پاتی تھی اور محفوظ بھی۔ وہ پہلا انسان تھا جس نے
اسے حسن کے پیکر کے آگے بھی کچھ سمجھا تھا۔ اس کی تحریر کے ان پہلوؤں کی اسی انداز میں
تعریف کی تھی جس انداز میں اس نے محسوس کر کے اسے لکھا تھا۔ تعریف کا جملہ جب بھی
استعمال کیا اس کے دماغ کے لیے کیا اس کے بعد کے ایک آدھ جملے نے اس کے حسن کے
کسی پہلو کو چھو لیا ہو تو چھو لیا ہو۔ یونہی، ضمناً جیسے موسم کا ذکر کیا جاتا ہے یا کسی کتاب کے سرورق
کی بات کی جاتی ہے۔ سادہ سے انداز میں غیر اہم سے انداز میں۔ کبھی اچانک کہہ دیتا "تمھارا
کل والا مضمون دیکھا، بھئی واہ! یقین نہیں آتا کہ اس چھوٹے سے سر میں اتنا بڑا دماغ
ہے۔" وہ اس کا سر ہاتھ سے پکڑ کر ہلاتا —— دوستانہ انداز میں۔ پھر اچانک اسے دیکھ کر
کہہ دیتا " ارے تم تو سفید لباس میں کہانیوں کی پری معلوم ہوتی ہو" بالکل یونہی۔
بغیر کسی تاثر کے۔ اور وہ چپ چاپ اس کی باتوں کو بغور سنتی ہوئی اسے ٹکر ٹکر تاکا کرتی، اپنی
چوٹی سے کھیلتی ہوئی اور کبھی کبھی بات کرتے ہوئے اچانک رک کر وہ اس کی آنکھوں کو
بغور دیکھتا پھر خود ہی ہنس پڑتا۔ پھر کچھ سوچ کر کہتا۔ "تمھاری آنکھوں سے کتنی قابلیت
کتنی ذہانت ٹپکتی ہے۔ ویسے تمھاری آنکھیں ہیں بھی بہت خوبصورت۔" اس انداز سے جیسے اس
کی اطلاع کے لیے عرض کیا جا رہا ہو۔ اور وہ مسکرا دیتی۔ پھر وہ کچھ سوچتا پھر کہہ دیتا —— "اگر تم
اس سے بھی زیادہ حسین ہوتیں —— خیر وہ تو ممکن نہ تھا، ہاں اگر ہوتیں بھی تو بھی میرا تم سے کوئی
رابطہ رکھنا ہرگز ممکن نہ تھا اگر تم اتنی قابل جرنلسٹ نہ ہوتیں، اتنی محنتی لڑکی نہ ہوتیں۔ یہ تمھاری
ناک ایسی تیکھی ہے کہ دل میں چبھ جاتی ہے۔ اچھا یہ بتاؤ آج کل تمھارے لکھنے کی رفتار کچھ کم نہیں
ہو گئی —— تمھیں کیا لگتا ہے۔ لکھو نا۔ خوب جی لگا کر۔ بہت بڑی رائٹر بن جاؤ۔ اس سے بھی
اچھی۔" وہ اس کی ناک پکڑ کر ہلا دیتا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دیتی۔ پھر ایک دم خاموش ہو کر کچھ سوچتی
پھر مسکراتی —— کتنی اپنائیت تھی اس کی گفتگو میں۔ اس کی گھٹاؤں سی زلفوں کے تو بہت
دیوانے تھے مگر اس کے سر کی کسی نے تعریف نہیں کی تھی۔ اس کی کشمیری بادام ایسی لمبی لمبی
آنکھوں میں ڈوبنے کو ایک زمانہ تیار تھا مگر ان آنکھوں سے کسی کو قابلیت چھلکتی ہوئی نہ نظر آتی تھی اور

یہ جو کتنے ہی لوگوں کی INSPIRATION تھا اس کا کتنا خیال کرتا تھا۔ اس کی ایک بات کے جواب میں
کتنی باتیں سمجھاتا۔ سو طرح سے بیان کرتا۔ بولتے بولتے کہیں دور چلا جاتا۔ اپنے حاصل کیے
ہوئے علم کے سمندر میں ڈوب کر لفظوں کے موتی بکھیرتا۔ اور اس کی روح میں خوشیوں کی تتلیاں
رقص کرنے لگتیں کہ وہ اس کے علم کے کسی تار کو سوال کے مضراب سے بس ذرا سا چھیڑ دیتی ہے
اور وہ پورے ساز کی طرح بج اٹھتا۔ وہ اس کی ذہانت کی عاشق تھی۔ اس کی شخصیت کی پرستار
تھی، اس کی تحریر کی دیوانی تھی اس کے بارے میں سوچا کرتی تھی اور وہ بھی اس سے ملاقات کو ترجیح دیتا مگر
اپنا کوئی ضروری کام اس کی خاطر بھی نہیں چھوڑتا اور وہ اپنے کام سے انصاف نہیں کر پا رہی
تھی کہ وہ اس کے حواس پر مدہوش کن مہک کی طرح چھایا رہتا تھا۔ اور وہ تھا کہ اپنی تحریر کو
برابر وقت دیتا۔ سیمینار بلاتا، کانفرنسیں اٹینڈ کرتا، میٹنگیں کرتا، ملاقات کرتا تو ——
—— سوچ سمجھ کر —— وقت کا صحیح استعمال کر کے، وقت گنوا کر نہیں، وہی
بات کرتا جو وہ پسند کرتی۔ عالم تھا علم کو ضائع نہیں کرتا تھا کسی مصرف میں استعمال کرتا۔ وہ خود کو
اس کا سمجھنے لگی تھی مگر پھر بھی اس نے اپنے ان محسوسات میں اسے رازدار نہ بنایا تھا۔
کہیں کہیں سے وہ اب بھی محتاط تھی۔ شاید یہ عورت کی وہ چھٹی
حس تھی جو ازل سے مرد کی طاقت کے سامنے ڈھال بن کر اسے محفوظ رکھتی ہے یا اس
کا اپنے حسن کے تئیں مستقل خوف۔ کبھی کبھی وہ اچانک خاموش ہو جاتا اور پھر اچانک یہ کہہ دیتا
کہ یہ دوری اب اس سے برداشت نہیں ہوتی۔ وہ اس کے قریب ہونا چاہتا ہے۔ وہ خاموش
خاموش سنا کرتی۔ قریب ہونے سے وہ کیا کہنا چاہتا ہے کہ عمر بھر ساتھ رہنے کی بات تو کبھی
نہیں کی۔ یا شاید اسی طرح کہنا چاہتا ہو اور پھر ایک دن جب وہ کہیں دور پکنک پر گئے جہاں
ان کے علاوہ پانی، پیڑ، پھول اور تتلیاں تھیں۔ اس دن دانشور نے اور کوئی بات نہ کی۔ وہ اس
کے سراپے کو بادلوں اور پھولوں سے تشبیہ دیتا رہا مگر وہ جانتی تھی کہ یہ ذکر تو جانے کیسے ایسے
ہی ہمیشہ کی طرح ضمناً چھڑ گیا اور ابھی موضوع بدل جائے گا۔ مگر موضوع نہیں بدلا اور وہ بولتا
گیا" یہ ذہانت اور یہ ملکوتی حسن، اتنا حسین امتزاج میں نے آج تک نہیں دیکھا۔!" وہ کچھ سمجھتی
کچھ نہ سمجھتی خاموش دیکھتی اسے۔ عجیب سے تاثرات کے ساتھ۔" ہمارے خیالات، جذبات،

سوچیں سب ایک سی ہو گئی ہیں ۔ ہم کیوں الگ ہیں۔ ہمیں اور الگ نہیں رہنا چاہیے ...‘‘
وہ اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کرتا۔ اور وہاں اُسے اس کی دو بھولی آنکھوں کے درمیان
ابروؤں کے بیچ کھنچی ہوئی عمودی لکیر نظر آتی جیسے وہ کچھ سمجھ نہ پا رہی ہو یا جیسے ابھی اس نے
پوری بات نہ سنی ہو۔ وہ کچھ اور کہتا۔ رُک کر سمجھانے کے انداز میں ’’ تمہارا کیا خیال ہے ۔ میں
ٹھیک کہتا ہوں نا؟‘‘ وہ اس کا چہرہ بغور دیکھتا ہے۔ وہاں ایک شرمیلی سی مسکراہٹ کھیل رہی
ہوتی ہے، مگر آنکھوں میں پوری بات سننے کا تجسس ہوتا جیسے وہ خاموش چہرہ بول رہا ہو
’’ تو پھر میرے گھر والوں سے مجھ کو مانگ لیجیے نا ‘‘ مگر لب نہیں ہلتے اور وہ پھر کہتا ہے
اس کے چہرے کے پاس اپنا چہرہ لے جاکر اس کی آنکھوں سے اپنی آنکھوں تک ایک سلسلہ سا
باندھ کر تم سے تمہارا وجود مانگتا ہوں ۔ مجھے سمجھ رہی ہو نا۔ تم سے زیادہ مجھے کون سمجھے گا۔

یہ وجود ہمارے درمیان میں فصیل بن گئے ہیں۔ آؤ ان
فصیلوں کو گرا دیں کہ اس نکتے پر آ کے ہماری سوچیں ہمیں بانٹے دے رہی ہیں ۔ یہ خیمہ بندی کیوں۔‘‘
وہ کچھ دیر کو رُکا ____ اور وہ ____ خاموش دیکھ رہی تھی اسے۔ چہرے پر یقین اور بے یقینی
کے بیچ لکھا ہوا تذبذب بھرا سوالیہ نشان لیے ہوئے۔ وہ پھر کہنے لگا۔ ’’کہو! ہمارے بیچ چاہتوں
کا، قربتوں کا رشتہ ہے پھر یہ تکلفات کیوں؟...‘‘ وہ خاموش ہو گیا۔ وہ مجروح نگاہوں سے
اسے کچھ لمحے تک دیکھتی رہی پھر اس نے نظر پھیر لی ۔ اس کی ساکت نظریں دور
آسمان پر ایک منظر میں الجھ گئیں جہاں اچانک گرجتے، شور مچاتے، گھنے مٹیالے
بادلوں کا ریلہ ہری ہری چمکتی ہوئی پہاڑیوں کی چوٹیوں کو اپنے اندھیارے کالے دھوئیں میں
غائب کرنے جھکا آ رہا تھا۔ اور پانی کے کنارے ایک چٹان پر نیلے، فیروزی اور عنابی پروں
والا خوب صورت نیل کنٹھ بے خبر مچھلیوں کی گھات میں اپنی لمبی شکاری چونچ ایسے بند کیے بیٹھا
تھا جیسے کبھی کھولتا ہی نہ ہو۔ دانشور نے اسے بغور دیکھتے ہوئے ایک دوسرا انداز اپنایا کہ وہ
اس کے بارے میں سب جانتا تھا۔ اس نے اپنی کوئی بات اس سے چھپائی نہ تھی۔ وہ اس کے
خیالات و احساسات سے واقف تھا۔ اس کی اصول پرستی کو بھی جانتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا

کہ وہ اس کے بارے میں کس طرح کے جذبات رکھتی ہے ۔ وہ اپنے دانشورانہ انداز میں گفتگو کرنے لگا۔ " یہ بت بنی کیا سوچ رہی ہو۔ اس قدر خاموش کیوں ہو شاید تم سے کوئی نفسیاتی پیچیدگی وابستہ ہے۔ جس نے تمھیں اسی طرح زندگی کے لطیف پہلوؤں سے ناآشنا رکھا ہے۔ تم نے ریشم کے کیڑے کی طرح اپنے گرد یہ خول کیوں بن رکھا ہے۔ اس میں تمھارا دم گھٹ جائے گا ایک دن۔ غیر اہم چیزوں کو اتنی اہمیت تو مت دو میں نے اکثر تمھارے چہرے پر بے حد محتاط تاثرات دیکھے ہیں۔ ناقابلِ رسائی جیسے، ناممکن جیسے۔ تم انسان ہو۔ خود پر یہ جبر کیوں ؟

چھوڑ دو ان جھوٹے الیوژنز (ILLUSIONS) کو۔ بی اے پریکٹیکل گڈ گرل دلوں کو۔ یوں، علیحدہ نہ سوچو۔ اس وجود کی ہی وجہ سے ہم ملے" وہ کہہ رہا تھا۔ جانے پھر اس نے اور کیا کیا کہا۔ مگر وہ کب سن رہی تھی۔ وہ تو پانی کو دیکھ رہی تھی۔ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ شاید یہی کہ اگر پانی کا کوئی رنگ ہوتا تو وہ کبھی اپنا رنگ نہ بدلتا۔ نیلے آسمان تلے نیلا نہ ہو جاتا۔ اور ہریالی کے درمیان ہرا نہ نظر آتا اور کبھی اچانک سب رنگ جھاڑ کر اس بغیر نام کے رنگ میں نہ لوٹ آتا۔ مگر یہی تو اس کی شناخت ہے کہ بہتا تو ہر رنگ سمیٹ لیتا اور ٹھہرتا تو اصلی شکل میں ابھر آتا۔ اور دانشور کہہ رہا تھا" تمھاری سمجھ میں زندگی کا ایک نیا مفہوم آئے گا۔ تمھارے خیالات کی پرواز کو نئی وسعتیں ملیں گی۔" وہ کچھ نہیں سن رہی تھی۔ اسے اپنی گردن تھکی تھکی محسوس ہونے لگی۔ اس نے اپنی ٹھڈی اپنے گھٹنے پر ٹکا دی۔ آنسو کا ایک قطرہ اس کے پاؤں پر گرا، لڑھکا اور مٹی میں جذب ہو گیا۔ دفعتاً اس کے اندر کی بیدار عورت کو خیال آیا کہ اس وقت اسے کسی نہایت ضروری کام کا یاد آنا نہایت ضروری ہے ۔ اس نے دوسری آنکھ کی پلک پر اٹکے ہوئے آنسو کو چپکے سے بہہ جانے دیا اور بھیگی آنکھوں کو موندھ کر ان کی نمی کو کہیں اندر جذب کر کے دانشور کی طرف یہ کہنے کے لیے مڑی کہ اس کو کوئی ضروری کام یاد آگیا ہے مگر وہ اس سے بھی پہلے کھڑا ہو چکا تھا اور اپنے بالوں میں کنگا کر رہا تھا۔ اس کا سا منا ہوتے ہی بولا۔" یاد ہی نہ رہا آج میری ایک ضروری میٹنگ تھی۔ ابھی آدھے گھنٹے میں شروع ہونے والی ہے چانس لے لیتا ہوں ہو سکتا ہے پہنچ جاؤں۔ راستے میں تمھیں بھی DROP کرتا چلوں گا۔"

گندے نالے کے کنارے

مسز داس نے یہ بتاتے ہوئے کہ ان کے گھر میں دو روز سے صفائی نہیں ہوئی، مجھ سے میرا گھریلو خادم کچھ دیر کے لیے مانگا تو میں کچھ حیران سی ہوئی کہ ان کے وہاں جزوقتی طور پر کام کرنے والی لڑکی بلڈنگ میں بہت مقبول تھی۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔

وہ فرض شناس اور وقت کی پابند بھی تھی دوسرا سب کی دوست بھی۔

ساتھ ساتھ وہ پرکشش بھی تھی۔

"تومارے کو مالوم نائیں؟ اولور کی مور گیا۔" میرے چہرے پر سوالیہ قسم کے تاثرات دیکھ کر مسز داس نے کہا ———— کہیں وہ یہ تو نہیں کہہ رہیں کہ وہ لڑکی مر گئی۔ ایک دو روز پہلے ہی تو میں نے اسے دیکھا تھا۔ میں دفتر کے لیے نکلی تھی تو وہ نیچے والے فلیٹ کی سیڑھیوں پر پوچھا لگارہی تھی۔ موٹی موٹی گھنگھریوں والی پازیب چھنکاتی ہوئی۔ ایک ایک زینہ اترتی اور اس کو پونچھتی۔ اوپر کے زینے پر مجھے دیکھ کر رک گئی۔ سلام کر کے مسکراتی ہوئی بولی۔ ذرا ٹیر جاؤ میم ساب۔ ابی گیلا ہے۔ پیر پسل جائے گا۔"

میں رک گئی۔ اسے حیرت اور دلچسپی سے دیکھنے لگی۔ کئی مہینے بعد دیکھ رہی تھی میں اسے۔

ویسے وہ ہماری بلڈنگ کی پہلی منزل پر رہنے والے داس بابو کے ہاں پچھلے چار پانچ برس سے کام کر رہی تھی۔ جنوبی ہند سے تھی۔ نام بیلا تھا اس کا۔ جیسے بیلے کا پھول یا پھر بیلا یعنی صبح۔ ———— سال بھر پہلے جب اس کی شادی

ہوئی تھی تو ہم سب بلڈنگ والوں نے اس کی کچھ نہ کچھ امداد کی تھی۔ لڑکا اسے اچھا مل گیا تھا۔ اسے چاہتا بھی بہت تھا۔ دونوں خوش تھے۔ تین چار مہینے پہلے وہ اپنے وطن گئی تھی۔ اس نے کچھ منت مانی تھی جسے پورا کرنے کے لیے دونوں میاں بیوی کو تیروپتی مہاراج کے مندر میں حاضری دینا تھی۔

تب سے میں نے اسے آج دیکھا تھا۔ وہ لمبے لمبے بال جو اس نے تیروپتی مہاراج کو ارپن کیے تھے، تھوڑے تھوڑے اُگ آئے تھے۔ انھیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے کسی ماہر ہیئر ڈریسر نے اس کا ہیئر کٹ بالکل جدید طرز پر کیا ہو۔ کانوں میں چھوٹی چھوٹی سونے کی بالیاں جو اس نے شادی پر پہنی تھیں اور جو اس کے گھنگھریالے بالوں کی ڈھیلی گندھی ہوئی چوٹی میں چھپی رہتیں اور نظر آتے بھی لگتیں تو اس کے بالوں پر سجا چنبیلی کے پھولوں کا گجرا جسے وہ پابندی سے لگایا کرتی تھی ان بالیوں کو چھپا دیا کرتا تھا۔ وہ بالیاں اب واضح طور پر نظر آرہی تھیں اور اس کی گردن میں پڑی کالی پوت میں سجے سنہری دانوں کے ساتھ میچ کر رہی تھیں۔ اس کی کاجل لگی بڑی آنکھیں اوپر مجھے دیکھتے ہوئے بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ اس نے دونوں نتھنوں میں لونگیں پہن رکھی تھیں۔ وہ پہلے سے زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔ دبلا پتلا محنت کش جسم بھرا بھرا سا لگ رہا تھا۔ اس کے مسکراتے ہوئے چہرے پر ایک پُر سکون تقدس سا تھا۔ شاید تیروپتی میں درشن کر کے اپنے سارے دُکھڑے بھگوان کو سونپ کر وہ مطمئن ہو گئی تھی۔

میں اس کی بات سن کر رک گئی۔ میرے دل میں اس کے لیے کچھ شفقت سی کچھ محبت سی امڈ آئی۔ شاید اس کے اس اپنائیت بھرے جملے سے۔ مگر محبت تو سبھی کرتے تھے اس سے۔ وہ بلڈنگ والوں کی مشترکہ بیٹی کی طرح تھی۔ "بہت پیاری لگ رہی ہو بیلا... !" میں زینہ خشک ہونے کے انتظار میں وہیں ایک سیڑھی پر بیٹھ گئی۔ وہ کچھ شرما سی گئی۔ سانولی سلونی تھی وہ اس لیے میں اس کے چہرے کو گلابی ہوتے نہ دیکھ سکی۔ مگر وہ جیسے کہ پونچھے والی بالٹی پر اور زیادہ جھکتے ہوئے بولی "تیروپتی مہاراج کی کرپا ہے میم ساب۔"

" ارے بالٹی میں کیوں گھسی جا رہی ہو۔ فینائل ہے اس میں۔ آنکھ منہ میں چلی گئی تو؟" میں نے کہا۔ اس نے جلدی سے سر اوپر کیا اور اپنی نرم سوتی ساڑھی سے چہرہ صاف کیا۔ جب

میں نے زینہ طے کیا تو اس کے چہرے کے تقدس کا راز جان گئی۔ بھگوان نے اس پر واقعی کرپا کی تھی۔ یہ نور ممتا کا تھا جو اس کے وجود سے پھوٹ رہا تھا۔ بہت اچھا ہوا جو اس کی دعائیں قبول ہوئیں۔ وہ بھی تو سب کی ہمدرد تھی۔

ہر ایک کے کام آنے والی۔ ہر وقت ہنستی کھیلتی رہنے والی۔ مجھے یاد ہے ایک بار ہمارے باورچی خانے کے گرم ہوا باہر پھینکنے والے پنکھے میں تاریں پگھل کر جڑ جانے سے آگ لگ گئی، ہم سب یہ دیکھ کر حواس باختہ ہو گئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں کہ جانے کہاں سے وہ آ نکلی اور ایک بڑا سا تولیا لے کر پنکھے پر ایسے پٹخا کہ آگ بجھ گئی، مگر پنکھے کے پنکھ چونکہ پلاسٹک کے تھے اس لیے اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اڑ کر اس کے چہرے سے چپک گئے، اور وہ بغیر اُف کیے چہرہ ہاتھوں سے ڈھکے غسل خانے کی طرف بھاگی۔ ہم اس کی طرف سے بے خبر آگ لگنے کی وجہ پر قیاس آرائیاں کر رہے تھے کہ وہ چہرہ پونچھتی ہوئی اندر آئی، اس کے خوبصورت ماتھے کے ایک کونے پر ایک چھوٹا سا داغ پڑ گیا تھا۔ تکلیف سے بے بس ہو کر وہ ایک دم سے چہرے کو شاید سہلاتے ہوئے جب باتھ روم کی طرف بھاگی تھی تو اسی وقت اس کے چہرے کی جلی ہوئی کھال چھل جانے سے وہاں ایک مستقل داغ بن گیا تھا۔ دو تین ننھے ننھے نشان اور بھی پڑ گئے تھے اس کے چہرے پر۔ آنکھ کے سفید حصے پر پتلی کے بالکل قریب ایک چھالا سا پڑ گیا تھا۔ شکر ہے پتلی بچ گئی تھی۔

ڈاکٹر کے پاس لے جاتے وقت جب میں نے اس سے پوچھا کہ یہ اس نے کیا کیا۔ اگر کچھ ہو جاتا اسے، تو بولی "آگ زیادہ بڑھ جاتی تو؟ سب لوگ کو خطرا ہو جاتا نا میم ساب میں ڈرتی نہیں۔ جب تک اوپر والا نہ چاہے کچھ نہیں ہو سکتا۔ مجھے اچھا کام کرنا بہوت اچھا لگتا ہے"

ایک اور دفعہ، ہماری بلڈنگ کے پیچھے سرونٹس کوارٹر بن رہے تھے۔ گھروں کی بنیادیں کھدی ہوئی تھیں کہ بارشیں شروع ہو گئیں۔ صبح سے رات اور رات سے صبح تک لگاتار۔ ذرا سا موسم ٹھیک ہوا تو بچے کھیلنے نکلے۔ برابر والے ملک صاحب کا گل گوتھنا سا بیٹا اپنی ٹرائی سکل

چلاتے بلڈنگ کے احاطے کے اندر کے کچے راستوں میں ننھے ننھے گڈھوں کے پانیوں کو چھوٹے
چھوٹے آبشاروں کی طرح اچھالتا ہوا، سرونٹ کوارٹرس کی بنیاد کے لیے کھدی قد آدم نالیوں کے
جمع شدہ پانی کے متوقع آبشاروں کی کشش سے مغلوب ہو کر نئے معرکے سر کرنے کی خواہش اور
خوشی کے ملے جلے جذبوں میں کھویا وہاں پہنچا ہی تھا کہ مع اپنی تین پہیوں والی سائیکل کے پانی میں
کہیں کھو گیا۔ جانے بلڈنگ کے کس گھر کی کس کھڑکی سے بیلا کی نظر پڑی تھی اور وہ روشنی کی
رفتار کی سی تیزی سے وہاں پہنچ کر پانی میں اتر کر منّے کو باہر نکالنے میں تو کامیاب ہو گئی، مگر اگر
وہاں سے گاڑی میں گزرتے ہوئے ملک صاحب اسے ہاتھ کا سہارا دے کر باہر نہ کھینچتے تو
پتہ نہیں کیسے باہر آتی۔ آتی بھی یا نہیں کہ کچھ ایسا لمبا قد بھی نہ تھا اس کا۔ خطروں سے کھیلنے کا
تو اسے شوق تھا شاید۔ مگر نہیں۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ جو بھی کرتی تھی وہ سب اتنا اہم ہوتا کہ
اسے اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آتا اور ہم ہر بار یہ ہی سوچتے رہ جاتے کہ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو
جانے کیا ہو جاتا۔

میں نے آخری زینہ اترتے ہوئے مڑ کر اس کے چھوٹے چھوٹے بالوں کو دیکھ کر مسکراتے
ہوئے پوچھا، "آج گجرا نہیں لگایا بیلا؟" "یہ تو رہا میم ساب" اس نے پہلو کے کونے میں
بندھے نرم نرم گچھے کو ناک سے لگا کر لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ اور ہم دونوں کھلکھلا کر
ہنس پڑیں۔

مسز داس کی بات کو نہ سمجھنے کی کوشش میں دھک دھک کرتے دل کو سنبھالتے ہوئے
میں نے پوچھا۔ "کیا کہا آپ نے؟"

"وہ لورکی بیلا مور گیا۔ گھر کو جاتا تھا۔ راستے میں گر کر مور گیا۔" وہ بولیں۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ ——" میں کانپ سی گئی۔ "ابھی کل ہی تو —— پرسوں ہی تو ——
میرا مطلب ہے دو دن پہلے ہی تو آئی تھی وہ کام پر۔ مجھے ملی بھی تھی۔ آپ کے گھر کے باہر
زینہ صاف کرتی ہوئی۔" میں تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولی۔

مگر واقعی ایسا ہوا تھا۔ بیلا سچ مچ مر گئی تھی۔ ہم کئی لوگ اس کے گھر گئے۔ اس کا شوہر
ایک دم سکتے میں اس کی لاش کے قریب بیٹھا تھا۔ اس روز وہ کام ختم کر کے جلدی گھر روانہ

ٹریفک سگنلز کے پاس بس رکی تو وہ جو قریب ہی رہتی تھی بس سے
ہوئی تھی۔
اترنے لگی۔ دروازے پر جمع بھیڑ میں سے نکلتے ہوئے وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ پائی۔ گرگئی اور
اس کا سر سنگِ میل سے ٹکرا گیا۔ خون تیزی سے بہنے لگا۔ ڈھیر سارے تماش بینوں کے
درمیان سے کچھ لوگ آگے بڑھے اور اسے اٹھا کر ہسپتال لے جانے لگے۔ پاس سے
گزرتے ہوئے پولیس والے کو دیکھ کر اس نے اپنے شوہر کو تلاش کرنے کی پریشانی سے
بچانے کے لیے ہاتھ جوڑ کر کہا تھا " داروگا جی، میں بلیلا، گندے نالے کے کنارے ساتویں
جھگی میں رہتی۔ آنندن کی گھروالی۔ اسے بتا دینا میں گرگئی۔ ہسپتال جارہی ہوں۔"

مگر ہسپتال پہنچتے پہنچتے اتنا خون بہہ گیا تھا کہ اس نے دم توڑ دیا۔ داروغہ جی کے
علاقے میں نالے کے اس پار کا احاطہ نہیں تھا ــــــــ۔۔۔

آنندن حادثے سے بے خبر ساری رات اپنی بیوی کو ڈھونڈتا رہا آس پاس کی سبھی پولیس چوکیوں
میں خبر کرائی تھی۔ دوسرے دن اسے ایک نرسنگ ہوم سے بلاوا آیا جہاں اس کی بیوی کی
لاش اس کے سپرد کر دی گئی۔ اس کی اپنی ہی ساری میں چھپی ہوئی۔ آنکھوں کی جگہ گہرے گہرے
گڈھوں میں روئی کے دو گالے ٹھونسے گئے تھے۔ ماتھے پر جما ہوا خون سوکھ گیا تھا۔ سر
سے بہتا ہوا خون گردن پر پپڑیوں کی شکل میں نظر آرہا تھا۔ چوٹ صرف سر پر لگی تھی۔ مگر زخم
اس کے سارے جسم پر تھے۔ دل کی جگہ ایک گہرا گڈھا تھا۔ جگر کی جگہ ایک لمبا سا چاک
ـ جگہ جگہ۔ جسم چھید چھید تھا سفید سرخ روئی سے بھرا خون سے
لت پت۔ کوئی چاک سینے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی گئی تھی بیس بائیس برس کے اُس
ہنستے کھیلتے وجود کو اس دل خراش اور بھیانک لاش میں بدلتے ہوئے صرف کچھ گھنٹے لگے
تھے۔ اس کی دماغی موت ہوئی تھی۔

نرسنگ ہوم کو لاش واپس کر دینا چاہیے تھی۔ اور اگر اس کی ضرورت تھی
تو اس سلسلے میں فوراً اس کے شوہر سے رابطہ قائم کرنا چاہیے تھا۔

ــــــــ مگر ــــــــ

وہ ______ مر چکی تھی۔ اس کے اوپر وہی ساری پھیلی ہوئی تھی جس میں میں نے اسے دو روز پہلے دیکھا تھا۔ اس پر جگہ جگہ خون کے خشک دھبے تھے۔ اس کے پلو کے کونے میں بندھے چمبیلی کے پھول پژمردہ ہوکر بدرنگ ہو گئے تھے۔ اس کے وجود سے پھوٹنے والی کونپل بھی ٹوٹ کر گر گئی تھی۔

ہم لوگ اپنے آنسو روک نہیں پا رہے تھے۔

" نرسنگ ہوم والوں سے ہم تم کو پیسہ دلوائیں گے۔" مسز ملک نے اس کے شوہر کے شانے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے کہا۔ وہ بُت بنا چپ اپنی بیلا کا سر اپنے زانو پر رکھے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو لگاتار رواں تھے۔ جب سے ہم آئے تھے اس نے ایک بات بھی نہیں کی تھی۔ ساری باتیں اس کے پڑوس والے بتا رہے تھے۔ یہ بات سن کر اس نے سر اٹھایا: "میری بیلا ______ میم ساب۔ میرا بچہ ....."
وہ ہچکیاں لیتا ہوا لاش کا ماتھا سہلانے لگا۔ اس کے بال سنوارنے لگا۔ ہم سب بے بس اداس اور پریشان اسے دیکھ رہے تھے۔ بیلا کی آنکھوں کے گڈھوں والے بے رنگ چہرے پر موت کا سکوت تھا مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے دودھیا شیشوں والا چشمہ پہنے سو رہی ہو۔ اگر اسے پل بھر کو زندگی مل جاتی تو شاید ہم سب کو تسلی دیتی۔ کہتی، کیوں رو رہے ہو میم ساب؟ کیوں دکھی ہوتے ہو! ______ کسی کے کام
پھر اور کیا چاہیے میم ساب۔ کسی کے لیے کچھ کام کرنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے !!!
میری آنکھوں میں آنسوؤں کا تازہ سیلاب اُمڈ آیا۔ اپنی سسکیوں کو دبانے کے لیے میں نے منہ پر رومال رکھ دیا۔ میں جانتی تھی کہ کئی روز تک یہ سانحہ بھول نہ پاؤں گی۔ جانے کتنے ______ کتنے ___ سانحے ______

دُھندلے آئینے

بیوٹیشن کی تین گھنٹے کی انتھک محنت اور فنکارانہ کوششوں نے مجھے اس لائق تو بنا دیا کہ
میں بدصورت نہ لگوں مگر خوبصورت بھی نہ بن پائی کہ شامیانے تلے جمع خواتین کے چہروں پر مجھے
دیکھ کر رشک آمیز یا تعریف آمیز تاثرات پیدا ہوں۔ حالانکہ ہلکی ہلکی سرگوشیاں تو میں بھی سن رہی
تھی جیسی شہد کی کئی مکھیاں ایک ساتھ بھنبھنا رہی ہوں مگر مجھے یقین تھا کہ میری ہمدردوں نے
کم از کم اطمینان کا سانس تو ضرور لیا ہوگا کہ آخر کار میں گوارا ہو ہی گئی اور میری دشمنوں نے خدا
کا شکر بجالایا ہوگا کہ میں لگی بالکل ویسی جیسی انھیں امید تھی۔ میری کئی سہیلیاں میرے دائیں
بائیں اور پیچھے چلی آرہی تھیں۔ کسی نے میرا بھاری دوپٹہ سنبھال رکھا تھا۔ کسی نے غرارے کو
میرے ٹخنوں سے ذرا سا اوپر اٹھا رکھا تھا اور میں خواہ مخواہ آہستہ چلتی ہوئی۔ آخر کار تین گاؤ تکیے
لگے ایک خوبصورت سے غالیچے پر بٹھا دی گئی۔ میری سہیلیاں اور کزنز وغیرہ میرے زیورات ٹھیک
ٹھاک کرنے لگیں اور میں تکیے سے ٹیک لگا کر آرام سے بیٹھ گئی کہ یہ میرا مائیکے میں آخری آرام
تھا۔ لوگوں نے مجھے دور سے ہی سمائل دی اور کوئی خاص ہی میرے قریب مجھے غور سے دیکھنے
آیا۔ اس نے بھی سوائے میرے زیور اور مہندی کے ڈیزائن کے اور کسی چیز میں دلچسپی نہ دکھائی۔
مگر میں پھر بھی مطمئن تھی کہ خلاف توقع میں بُری نہیں لگ رہی تھی۔ حالانکہ میری سہیلیوں اور امّی
وغیرہ نے میری بہت تعریف کی تھی اور میری کچھ گھنٹے بعد بننے والی نند نے میرے اوپر سے کئی
نوٹ وار کر بانٹ بھی دیے تھے مگر پھر بھی میں اپنے بارے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھی۔

اور نہ ہی خوبصورت لگنے کی کچھ ایسی خواہاں تھی۔ ہاں میرا خوبصورت دل ضرور اندر سے اداس تھا اور اس کی وجہ میری صورت نہیں تھی یہ ہی کیا کم تھا کہ ابٹنوں اور لوشنز کی مدد سے میرا سانولا رنگ کچھ صاف لگ رہا تھا اور قیمتی لباس کی بہترین ڈیزائننگ میں میرا موٹا بدن کسی درجہ تناسب میں آگیا تھا۔ میرے سیاہ فام نیگرو جیسے تنگ تنگ گھنگھریالے بالوں کا جنگل ایک خوبصورت سے جوڑے کی شکل میں گندھا میرے چہرے کو فریم کر دیا تھا۔ میری سنگھاڑے جیسی ناک کی بناوٹ پر دھیان نہ جاتا تھا کہ اس میں کئی ننھے ننھے ہیرے جڑی لونگ سج رہی تھی اور میری گول گول کچھ زیادہ ہی پھیلی آنکھوں کو آئی پینسل سے بادامی سی SHAPE دے کر میرے نیم گنجے پپوٹوں پر نقلی پلکیں چپکا دی گئی تھیں اور موٹے لبوں کو تنگ دائرے کی شکل میں لپ سٹک لگا کر چھوٹا کر دیا تھا۔ میری عمر زیادہ نہیں تھی۔ قریب سترہ سال کی تھی ہیں۔ مگر جانے کیوں امی کو میرے بیاہ کی جلدی تھی۔ کم از کم میں ذرا اور بڑی ہو جاتی۔ پھر AROBICS وغیرہ سے خود کو ذرا SLIM اور کچھ SMART بنا دیتی کہ بیچاری بیوٹیشن کو اتنی محنت تو نہ کرنی پڑتی اور اس سب کے بعد بھی لوگ مجھے ایسے نہ دیکھتے جیسے کہہ رہے ہوں کہ یہ نہائے گی کیا اور نچوڑے گی کیا۔ اور ان سب باتوں سے الگ میری تو کچھ اور ہی سوچ تھی۔ مجھے اپنی فکر ہی کب تھی۔ مجھے تو سب ایک دلچسپ سا تماشا لگ رہا تھا کہ یہ تو ایک خواہ مخواہ کی شادی تھی ورنہ کوئی مجھے بیاہنے کے لیے مرا تھوڑا ہی جا رہا تھا۔ مجھے تو کچھ اور ہی ارمان تھے۔ مجھے تو صرف اپنی اپیؔ کی فکر تھی۔ اپنی پیاری اپیؔ کی۔ دنیا کی سب اپیوں سے اچھی میری اپیؔ کی میں یہ ہی سب سوچ رہی تھی کہ مجھے اچانک محسوس ہوا جیسے لوگ یکایک خاموش ہو گئے ہیں۔ غور سے دیکھا تو واقعی سب لوگ ایک دم چپ چپ سے تھے۔ کچھ چہروں پر حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات تھے۔ کچھ پر مسکراہٹ اور ایک آدھ پر تو ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ شامیانے تلے بیٹھے لوگ گھر کی سیڑھیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جب میں نے ادھر نگاہ ڈالی تو بے یقینی اور مسرت کی ملی جلی سی چیخ میرے منہ سے نکلی "اپیؔ"۔ شامیانے کے ایک کونے کے پاس کھڑی امی ہاتھ میں خشک میووں کا بڑا سا تھال لیے کہیں جاتے جاتے رک گئی تھیں اور چھوٹے بھیا کا منہ حیرت سے نیم وا تھا اور میں جانے کب کھڑی ہو گئی تھی۔ اپیؔ سیڑھیوں سے نیچے آرہی تھیں۔ کسی دوسرے ہی ——— نہیں اپنے ہی اصلی روپ میں۔

جس میں انھیں دیکھے ہمیں مدتیں گزر گئی تھیں اور جس روپ کے ساتھ میرے اور شاید خود اپی کے علاوہ غالباً سب ہی نے سمجھوتہ کر لیا تھا اور یہ سب کوئی غیر نہ تھے سب اپنے تھے۔ میرے اپنے۔ میری پیاری اپیا کے اپنے۔ مجھے اپنی بصارت پر اعتبار نہ ہو رہا تھا۔ اپی میرے سامنے زینہ طے کر کے نیچے آ رہی تھیں اور میری آنکھیں جانے کب لبالب بھر آئی تھیں کہ انھوں نے تو اپنے آپ کو جانے کہاں چھپا دیا تھا۔ وہ جانے کون بن گئی تھیں اور اگر اپیؔ نے اپنے اوپر یہ انداز نہ اوڑھا ہوتا تو جانے آج ہم سب کی زندگیاں کیسی ہوتیں۔ میری زندگی، چھوٹی آپا کی، چھوٹے بھائی جان کی، بات صرف ہم تینوں کی نہ تھی بلکہ اپیؔ کی اپنی زندگی کی بھی تھی۔ یہ بات دوسری تھی کہ ہم چار نہیں پانچ بھائی بہن تھے۔ سب سے بڑے بھائی جان تھے جن کی شادی ابا کی حیات میں ہوئی تھی۔ اور جو ابا کی حیات ہی میں سرکار کی طرف سے حاصل کیے بنگلے میں منتقل ہو گئے تھے۔ کبھی کبھار ملنے آ جاتے مگر جب سے ابا فوت ہوئے انھیں چالیسویں کے بعد دیکھے برسوں ہو گئے۔ اس کے بعد ہم چار بہن بھائی۔ ہم سبھی کم سن تھے صرف اپیؔ کچھ بڑی تھیں۔ بی۔ اے کا امتحان دے چکی تھیں۔ خوبصورت، ذہین اور حساس۔ پھولوں اور رنگوں سے پیار کرنے والی۔ ہنس مکھ اور شوخ۔ سنہری رنگت، سیاہ بال، بھوری آنکھیں۔ زیادہ تر ساری پہنتیں جو ان کے سراپے سے لپٹ کر اور خوبصورت ہو جاتی۔ چھوٹے چھوٹے جاذب پاؤں جو ہمیشہ انگوٹھے میں پھنسنے والے پنیل ہیل کے سینڈلوں میں سجے رہتے۔ اور چلتے وقت ایک پر وقار سا ترنم چھیڑ دیتے۔ کمر سے نیچے جاتے ہوئے بال جو گردن کے پاس ایک بڑے سے کلپ کی تحویل سے آزاد ہونے کے لیے اِدھر اُدھر ریشم کے لچھوں کی طرح مچلتے پھسلتے رہتے۔ کلائیوں میں لباس سے ملتی جلتی چوڑیاں اور تھوڑے تھوڑے بڑھائے ناخنوں پر اسی رنگ کی نیل پالش اور رنگوں کا انتخاب ایسا جاذب، ہلکا ہلکا کہ دیکھ کر آنکھوں میں ٹھنڈک پڑ جائے، جیسے پیازی، کاسنی، پھیکا سفید، ہلکا لاجوردی وغیرہ۔ اس طرح کے ملبوسات میں لسی اپیؔ باغیچے کے ایک کونے میں سفیدے کے درخت سے لپٹی عشقِ پیچاں کی سفید، بیگنی اور نیلے نیلے پھولوں والی بیل کے پاس بید کی کرسی ڈالے گود میں کتاب لیے مطالعہ کیا کرتیں۔ پاؤں چپلوں سے آزاد نرم نرم گھاس سے کھیل رہے ہوتے۔ گردن ایک طرف کو خمیدہ سی ہوتی اور بال شانے کے اوپر سے ہوتے ہوئے

گودمیں گررہے ہوتے۔ کبھی ہوا میں اڑرہے ہوتے اور اپی گردوپیش اور خود سے بے خبر ہوتی تب تک جب تک سفیدے کی کسی شاخ پر سُرمئی رنگ کے پروں اور نہایت سریلی اور میٹھی آواز والی کستوری نہ بولنے لگی۔ پی۔ پی۔ پی پیو پیو، پی۔ پی۔ پی پیو پیو۔ یہی وہ وقت ہوتا جب شام سج سنور کر نارنجی اوڑھنی اوڑھ کر لان میں اتر آتی اور اپی کے پیروں سے تب تک لپٹی لپٹی پھرتی، جب تک ہوا کچھ اور ٹھنڈی نہ ہوجاتی اور فضا میں کاجل نہ گھلنے لگتا۔ تب اپی کتاب بند کرکے اٹھ جاتیں۔ اور گھاس پر ٹہل ٹہل کر کبھی پھولوں پر غور کرتیں کبھی گردن کو پیچھے پھینک کر دور آسمان پر۔ اپنے اپنے آشیانوں کو جاتے ہوئے طیور کو تاکا کرتیں۔ ابّو کے آنے کا بھی یہی وقت ہوتا، اُن کی گاڑی کا ہارن دور سڑک سے ہی پہچان لیتے تھے ہم۔ اور گاڑی کے پہنچنے تک گیٹ کھل چکا ہوتا اور اپی چائے کا انتظام کرچکی ہوتیں۔ ابو آتے ہی چائے پینے کے عادی تھے وہ بھی اپی کے ہاتھوں۔ یہ ان کا معمول تھا کہ شام ڈھلتے ہی شوروم بند کرواکر گھر آجاتے اور یہ بات ہم سب جانتے تھے اور پی۔ پی۔ پی پیو پیو بولنے والی کستوری بھی جانتی تھی جو دن کا ہر پہر ڈھلنے پر اپنی میٹھی میٹھی بولی سے وقت کے گزرنے کی یاد دہانی کراتی اور ہم سب سے زیادہ یہ بات اپی جانتی تھیں کہ اپی، ابّو کی بیٹی نہیں بیٹا تھیں۔ اور ابّو ہمارے ابّو ہی نہیں دوست بھی تھے اور ابّو بیٹیوں کو بیٹوں کی طرح چاہتے تھے۔ اور اپی ان کی سب سے لاڈلی بٹیا تھیں۔ بڑے بھیّا کے منتقل ہوجانے کے بعد گھر اور باہر کا کام اپی نے ہی سنبھال لیا تھا۔ ابّو ہر بات میں ان کا مشورہ ضرور طلب کرتے۔ وہ انھیں اونچی تعلیم دلوانا چاہتے تھے مگر امّی ان کے بیاہ کے لیے بےقرار تھیں کہ خاندان ہی کے کتنے رشتے ان کے اقرار کے منتظر تھے اور یوں بھی امّی بیٹیوں کو ہمیشہ بوجھ ہی سمجھتی رہیں وہ شاید اپنے بیٹوں کو کچھ زیادہ ہی چاہتی تھیں۔ گھر میں کچھ فیصلہ ہونے ہی والا تھا کہ ابّا ایک روز گہری نیند سو گئے۔ صبح ہوئی تو جاگے ہی نہیں۔ ہماری سمجھ میں ان دنوں کچھ بھی نہ آتا تھا۔ سوئے ہوئے ابّو کو ہلا ہلا کر جگانے کی کوشش کرتے پھر ہار کر رو دیتے۔ امّی نے ہوش کھو دیے تھے اور اپی کئی روز دم بخود تھیں۔ سفیدے کے تنے کے پاس بچھی کرسی پر عشق پیچاں کی بیل سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرے ہوئے پھول سوکھ سوکھ کر سوگواری کی تصویر پیش کرتے رہے اور اپی ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک بے مطلب ہی گھومتی رہیں۔ پھر

چالیسویں کے کچھ دن بعد جب لوگوں کا آنا تقریباً بند ہوگیا اور دور پار کے رشتہ دار کچھ روز رہ کر چلے گئے اور ہم سب یکسر تنہا پڑ گئے تو ایک دن جب ہم سکول سے لوٹے تو اپّی کو دیکھ کر حیران رہ گئے وہ تو جیسے ہماری اپّی تھیں ہی نہیں کہ ان پر پہلے کبھی یہ لباس دیکھا نہ ان کے بال ایسے تھے۔ وہ چشمہ جس سے انھیں ہمیشہ چڑ تھی ایک بھدے سے فریم میں جڑا ان کی آنکھوں کو چھپا رہا تھا کہ انھوں نے اپنے (CONTACT LENSES) کسی ڈبے میں بند کر دیے تھے اور وہ لمبی لمبی کشمیری بادام ایسی میری پیاری اپّی کی پیاری آنکھیں کہیں جا چھپی تھیں۔ وہ ریشمی بال اتنے زیادہ تراش لیے گئے تھے کہ بالکل بوائے کٹ رہ گیا تھا۔ انھوں نے کھدر کا لفواری رنگ کا کرتا پہن لیا تھا۔ اور اس پر سلیٹی رنگ کی واسکٹ۔ اور مٹیالے رنگ کی شلوار جو زیادہ کھلی تھی نہ تنگ۔ پیروں میں انگوٹھے والی فلیٹ سی چپل۔ ہاتھوں کو چھوتی ہوئی آستینیں اور کلائی میں صرف گھڑی، ناخن بے رنگ۔ وہ اپنی پڑھنے والی میز پر بیٹھی لکھ رہی تھیں۔ پہلی نظر میں مجھے لگا جیسے بڑے بھائی جان آگئے ہوں۔ پھر میرے دل کو ایک دھکا سا لگا اپنی پیاری اپیا کا یہ حلیہ دیکھ کر۔ ہمیں دیکھ کر انھوں نے اباکی سی مسکراہٹ چہرے پر بکھیر کر ہمیں خوش آمدید کہا۔ اور یوں ہماری اپّی، ابّو بن گئیں۔ انھوں نے ہمیں، گھر کو اور کاروبار کو سنبھال لیا۔ ان کا انداز امّی، ابّو دونوں کا خوبصورت امتزاج تھا۔ ہماری اپّی جیسی بالکل نہیں لگتی تھیں۔ انھوں نے نزاکتوں پر کھردرے پن کا پہرہ بٹھا دیا تھا۔ اور دل کے تمام جذبوں کو ممتا کے ایک جذبے میں ڈھال لیا تھا۔ حسین، خوابوں جیسی پُرسکون دنیا سے چونک کر جاگ اٹھی تھیں۔ اور خوابوں کے جھل مل کرتے، چھپتے چمکتے جگنو، حقیقت کی تیز تیز روشنیوں میں دکھائی ہی کہاں دیتے تھے۔ اور ان روشنیوں کو انھوں نے دل و جان سے کچھ اس طرح قبول کر لیا تھا کہ خوابوں نے جگنوؤں کے تعاقب میں جانا چھوڑ دیا تھا۔ آفس کا MANAGEMENT گھر اور ہم۔ یکایک وہ اتنی بڑی ہوگئی تھیں کہ امّی سے بھی بڑی لگنے لگی تھیں۔ اپنے لیے تو ان کے پاس وقت ہی نہ تھا اور اپنے لیے انھیں وقت چاہیے ہی کب تھا۔ ایک منٹ میں نہا کر بھائی جان کے سے انداز میں بال رگڑ رگڑ کر پونچھتی۔ نکلتے وقت ایک نظر آئینے پر ڈالی اور بالوں پر چار برش پیچھے کو پھیرے اور چل دیں۔ وقت جلدی جلدی گزرنے لگا۔ چھوٹی آپا نے بی۔ اے کر لیا۔ امّی کو ان کے بیاہ کی

فکر ہوئی ہی تھی کہ رشتہ طے بھی ہوگیا۔ چھوٹے بھائی جان بی۔ ایس۔ سی میں ہی دوسری بار فیل ہوئے اور نہ پڑھنے پر اڑ گئے۔ اپّی نے انھیں کمپیوٹر سکھلانے کی بہت کوشش کی تھی مگر ان کا کام میں جی نہ لگا۔ انھیں امتحانوں اور نتیجے کے درمیان چھٹیوں میں ٹی۔ وی کا ایسا چسکا پڑا کہ ہر وقت ہاتھ میں ریموٹ کنٹرول نظر آنے لگا۔ اور سستی کا یہ عالم تھا کہ شب خوابی کے لباس سے باہر پاؤں نہ نکالتے تھے۔ دوپہر ڈھلنے سے کچھ پہلے غسل فرمانے کا خیال آتا اور امیّ کے ہوتے ہوئے کسی کی کیا مجال جو انھیں کچھ کہہ دے۔ وہ تو امیّ کی نظر میں بچےّ ہی تھے اور اس بچےّ کے سر پر سہرا دیکھنے کا امیّ کو کچھ دنوں سے شوق بھی چرایا تھا۔ امیّ نے واقعی بیٹوں سے ہی محبت کی تھی شاید۔ بڑے بھیاّ نے خاندانی جائداد میں سے حصہ علیحدہ کروالیا تب بھی امیّ ان سے کبھی خفا نہ ہوئیں۔ برابر ان کے ہاں ملنے جاتیں تحفے تحائف لے کر۔ اور چھوٹے بھیاّ پر بھی نثار رہتیں۔ امیّ کہتیں کہ چھوٹی کے جانے سے جو سونا پن ہوگا وہ دلہن کے آنے سے دور ہو جائے گا اور پھر ان کا لاڈلا خود ہی ذمہ داری کا احساس کرے گا۔ مگر ہوا الٹا۔ چھوٹی کی ڈولی اٹھی۔ دلہن کا ڈولا اترا۔ پہلے بھیاّ کمرے سے نشست گاہ تک تو آتے تھے۔ اب وہ بھی بند ہوگیا۔ ان کی صبح شام کے چھ بجے ہوا کرتی اور امیّ انھیں بھولے سے بھی کچھ نہ کہتیں۔ میں بی۔ اے میں آگئی تھی۔ امیّ کو جیسے کہ مجھے پہلے ہی معلوم تھا، میری شادی کی فکر ہونے لگی۔ مگر... اپّی کی شادی کا تو کوئی ذکر ہی نہ کرتا تھا۔ امیّ نے تو جیسے اپّی والا باب ہی بند کر دیا تھا۔ کیا خود اپّی کے دل میں بھی دلہن بننے کا کوئی خواب نہ جاگتا تھا۔ مجھے یاد ہے جن دنوں گھر میں شادیاں تھیں۔ میں نے کئی دفعہ اپّی کے چہرے کے گرد ہلکے ہلکے دھندلکوں سا غبار دیکھا تھا مگر جب غور کیا تو وہاں سوائے احساسِ ذمہ داری کے اور کچھ نظر نہ آیا جیسے فرائض کی ایک گٹھری جیسے کوئی بزرگ بھائی۔ مجھے ان کے سراپے میں کوئی نسائیت نظر نہ آتی تھی۔ کبھی کبھی مجھے ایسا بھی لگتا تھا جیسے وہ خود کو لوگوں سے چھپانا ہی پسند کرتی ہوں۔ مگر اور کسی کا ادھر کوئی خیال تک نہ جاتا۔ میں ہی ان کے چشمے کے پار جا کر ان کی آنکھوں میں سنجیدگی ڈھونڈ لیا کرتی تھی۔ میں بھی ہر عمر میں اپّی سے کچھ زیادہ ہی بڑی رہی۔

عشق پیچاں کی بیل سفیدے کے بہت اوپر تک چلی گئی تھی۔ اس دوران اس پر کئی بار

پھول کھلے تھے اور مرجھا مرجھا کر گر بھی گئے تھے۔ اب بہار کا کچھ ہی حصّہ باقی رہ گیا تھا۔ میں بھی چلی گئی تو بیل کا کیا ہوگا۔ باغیچے کو میں ہی دیکھا کرتی تھی۔ امّی ہر طرف سے بے فکر ہی دکھائی دیتی تھیں۔ شروع سے ہی ہم لوگوں کو اپنی کی تحویل میں دے کر وہ مطمئن ہوگئی تھیں شاید۔

میری منگنی ہوگئی تھی۔ سارا گھر مصروف ہوگیا تھا۔ اماں کچھ زیادہ ہی مصروف تھیں کہتیں کہ گھر کی آخری شادی ہے کوئی ارمان نہ رہ جائے۔

امّی ایسا کہتے ہوئے کچھ ابّا کی روح کا

خیال بھی نہ کرتیں۔ فرمائشیں صبح سے شام تک جاری رہتیں اور اپّی جانے کتنی ہی بار گھر سے باہر اور باہر سے گھر آتی جاتیں۔ کبھی کبھی تو یوں ہوتا کہ اپّی نے گاڑی سے باہر ایک پاؤں نکالا اور امّی ایک اور لسٹ لیے گیٹ کے قریب پہنچ گئیں اور اپّی تھکی تھکی آنکھوں پر چشمے کو ٹھیک سے جما کر، ہونٹوں پر ایک جبریہ مسکراہٹ سجا کر گاڑی START کر لیتیں۔ کتنے دنوں سے وہ اتنی مصروف تھیں کہ آئینہ تک نہ دیکھا تھا انھوں نے۔ ان کے بال عجیب بے ترتیب سے ہوگئے تھے۔ کبھی پیچھے ایک چھوٹے سے ربڑ میں بند ہوتے اور کبھی گردن پر ایک مختصر سی بھدّی جوڑی کی شکل میں دکھائی دیتے۔ انھیں بال ترشوانے تک کی فرصت نہ ملتی تھی مگر اس دوڑ دھوپ اور تکان کے باوجود میں نے ان کے چہرے کو بہت پُرسکون دیکھا تھا۔ ویسے ہی جیسے آخری بیٹی کو وداع کرتے وقت باپ کے چہرے پر ہوتا ہوگا اور امّی بھی مطمئن اور خوش تھیں۔ اور اب جبکہ میری برات آنے میں گھنٹہ بھر باقی تھا کہ اپّی جو کچھ وقت پہلے بیوٹیشن کے ساتھ مل کر مجھے سجا سنوار رہی تھیں، کچھ دیر کے بعد خود باہر آئیں، دُھلی دُھلائی سی، نکھری نکھری سی۔ بیوٹیشن نے ان کے بال ذرا ذرا سے تراش کر نہایت سلیقے سے کھلے چھوڑ دیے تھے۔ اور اپّی کی خوبصورت آنکھیں چشمے کی زد سے باہر تھیں۔ چہرے پر ہلکا ہلکا سا میک اپ تھا اور میری اپّی نے اپنی پسند کے ہلکے ہرے رنگ کی ساری پہنی ہوئی تھی جس کا بارڈر سنہرا تھا۔ سیاہ رنگ کی پوری آستین کا بلاؤز اور پیروں میں سیاہ اور سنہرے رنگ کی پنسل ہیل کے انگوٹھے والے سینڈل جانے کب میں باہیں پھیلائے ان کی طرف دوڑ پڑی، پاس کھڑے چھوٹے بھیا دھیرے سے

بولے کہ یہ آپیؔ کو کیا ہوگیا ہے جو یہ حلیہ بنالیا ہے انھوں نے۔ میں ان کی فضولیات کو ان سنا کرتی ہوئی آپیؔ سے لپٹ گئی۔ میری آنکھیں چھلک پڑیں۔ امیؔ نے آگے بڑھ کر مجھے سنبھالا۔ سمجھایا کہ یہ دن تو ہر لڑکی کی زندگی میں آتا ہے۔ کوئی ساری عمر مائیکے میں تھوڑا ہی پڑا رہتا ہے۔ جانے میرے چہرے پر امیؔ کے لیے کیسے تاثرات ابھر آئے۔

ایک رشتے کی خالہ اٹھ کر قریب آئیں اور امیؔ کا چشمہ جو جانے کب سے دھول میں اٹا پڑا تھا ان کی آنکھوں سے اتار کر اپنے دوپٹے سے پونچھ کر ان کی آنکھوں پر واپس جماتے ہوئے محبت اور حیرت سے بولیں۔ تمھارا چاند آج گھٹاؤں سے نکل آیا اب تو اسے میرے دامن میں ڈال دو۔

اور امیؔ جیسے کہ حرکت میں آگئیں شاید اب انھیں سچ مچ صاف دکھائی دینے لگا تھا شرمندہ سی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتی ہوئی آگے بڑھیں اور آپیؔ کو باہوں میں بھر کر رو دیں اور ———

رُکی رُکی سی نظر چھوٹے بھیا پر ڈالی جو جھینپے جھینپے سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

ترنم ریاض کے نام پر بہت سے لوگ چونکیں گے لیکن کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ادب کی دنیا میں اپنی آہٹ سے یا آہنگ سے، لہجے سے یا معنویت یا افسانویت سے چونکانا بھی ایک جمالیاتی عمل ہے۔ جب جب کوئی نئی آواز ادب کے گنبدِ ہزار در میں ابھرتی ہے تو کسی کو اندازہ نہیں ہوتا، آیا یہ پہلی آہٹ کے بعد ڈوب جائے گی یا دیوار و در سے ٹکرا کر ارتعاش پیدا کرے گی اور سینوں کو برماتی جائے گی۔ **ترنم ریاض** وادیِ کشمیر کا گلِ نورس ہے جس نے افسانے کی دنیا میں قدم رکھا ہے جہاں زمین سخت اور آسمان دور ہے۔ دنیائے ادب کی رونق کیلیے نئے فنکاروں کا 'آون جاون' بنا رہے تو بہت خوب ہے۔ ہر فنکار اور ہر فن پارہ میرے آپ کے کہنے سے نہیں، اپنے حسن و خوبی سے زندہ رہنے کا حق چاہتا ہے، اور میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اس حق کا احترام کرتے ہیں۔ خدا کرے کہ ترنم ریاض ادب کی ہر موج سے کامیابی کے ساتھ نبرد آزما ہو سکیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ